www.cpsglobal.org

# الرسالہ

Al-Risala

January 2000 • No. 278

دوسروں کی شکایت صرف اپنی نااہلی کا اعلان ہے۔

# جنت کی زندگی

جاپان کے سفر (دسمبر ۱۹۹۰) میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ میں نے کہا کہ موجودہ دنیا عارضی جگہ ہے اور آخرت ابدی قیام کی جگہ۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی ''جنت'' ابدی دنیا میں تعمیر کرے۔ انہوں نے کہا: انسان کسی راحت یا لذت کی چیز سے تھوڑی دیر کے بعد اکتا جاتا ہے۔ چنانچہ جدید ترقی یافتہ دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر اکتاہٹ (boredom) کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں ابدی جنت سے کیا فائدہ۔

جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ ہمیشہ سے یہی بات کہتے آرہے ہیں۔ مگر یہ صرف ایک مغالطہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ اکتاہٹ استعداد تلذذ کے خاتمہ کی بنا پر آتی ہے نہ کہ خواہش تلذذ کے خاتمہ کی بنا پر۔

ان حضرات نے یہ فرض کر لیا ہے کہ جب ہم کسی لذت سے انجوائے (enjoy) کرنا چاہتے ہیں تو کچھ دیر بعد اس سے ہمارا جی بھر جاتا ہے۔ اور پھر اس میں ہمارے لئے لذت باقی نہیں رہتی۔ مگر یہ مفروضہ بجائے خود غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اپنے اندر غیر تسکین پذیر فطرت (insatiable nature) رکھتا ہے۔ انسان کو جو چیزیں مرغوب ہیں، ان سے وہ ابدی طور پر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔

مگر موجودہ دنیا میں انسان بے شمار محدودیتوں (limitations) کا شکار ہے۔ چنانچہ انسان جب بھی کسی مرغوب چیز سے انجوائے کرنا چاہتا ہے تو تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کی محدودیت اس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ رغبت کے باوجود وہ اس چیز سے انجوائے کرنے کی طاقت کھو دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم ایک لذیذ چیز کھاتے ہیں تو اس چیز کی لذت ہمارے لئے ختم نہیں ہوتی بلکہ ہمارا پیٹ بھر جاتا ہے، اس لئے ہم کو اسے چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اسی طرح اکثر دولت مند لوگ رغبت کے باوجود چیزوں کو کھانا چھوڑ دیتے ہیں، کیوں کہ انہیں

اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ موٹے ہو کر طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جائیں گے۔

یہی حال تمام دوسری لذتوں کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکتاہٹ یا بے رغبتی ہماری انجوائے کرنے کی استعداد کی حد ہے نہ کہ خود رغبت کی حد۔

جنت وہ جگہ ہے جہاں نہ صرف یہ ہوگا کہ تمام لذتیں مزید اضافہ کے ساتھ زیادہ مکمل حالت میں انسان کو دی جائیں گی، بلکہ ان لذتوں سے انجوائے کرنے کی استعداد کے سلسلہ میں اس کی محدودیت بھی ختم کر دی جائے گی۔ جنت میں یہ تضاد ختم ہو جائے گا کہ آدمی انجوائے کرنا چاہتا ہے مگر اپنی کسی کمی کی بنا پر وہ اپنی مرغوب چیزوں سے انجوائے نہیں کر پاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جنت انسان کے لئے ابدی خوشیوں کی جگہ بن جائے گی۔

دنیا میں آدمی کو جس اکتاہٹ (بورڈم) کا تجربہ ہوتا ہے وہ دراصل ایک تضاد کا نتیجہ ہے۔ آدمی پیدائشی طور پر ایک معیار پسند (idealist) مخلوق ہے۔ وہ چیزوں کو ان کی آئیڈیل صورت میں پانا چاہتا ہے۔ مگر اس دنیا میں ہر چیز غیر معیاری یا غیر آئیڈیل ہے۔ یہاں بورڈم کا اصل سبب یہی ہے۔

آدمی اپنے شوق کے تحت ایک چیز کی طرف دوڑتا ہے۔ اس کو پانے سے پہلے وہ اس فریب میں رہتا ہے کہ یہ عین وہی آئیڈیل چیز ہے جس کا وہ طالب تھا۔ مگر حاصل کر لینے کے بعد جب وہ اس کا تجربہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے مطلوب آئیڈیل سے بہت کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی کو تلاش کی لذت تو ملتی ہے مگر یافت کی لذت اسے نہیں ملتی۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے فریب لذت ہے اور آخرت میں حقیقی لذت۔ آخرت کی ہر چیز معیاری ہوگی۔ اس بنا پر وہ آدمی کے لئے حقیقی اور لامحدود لذت کا ذریعہ بن جائے گی۔ آدمی جو کچھ چاہتا ہے وہ جنت میں اس کو مزید اضافہ کے ساتھ مل جائے گا، اس لئے وہاں اس کے لئے اکتاہٹ کا کوئی سوال نہ ہوگا۔

# اسلامی جہاد

جہاد زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ جس چیز کو ہم عمل یا جدو جہد (struggle) کہتے ہیں اسی کا عربی مترادف جہاد ہے۔ جہاد نہ کوئی پراسرار چیز ہے اور نہ وہ تشدد کے ہم معنی ہے۔ وہ سادہ طور پر بھر پور کوشش کے لئے بولا جانے والا ایک لفظ ہے۔

اردو میں ہم کہتے ہیں کہ جب میں بڑا ہوا اور جدو جہد حیات کے مرحلہ میں داخل ہوا۔ اسی طرح عربی میں کہا جاتا ہے کہ **بذل جھدہ** اس نے اپنی پوری کوشش صرف کی۔ اسی طرح انگریزی میں کہتے ہیں کہ:

We must struggle against this prejudice

کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا ایک عام انسانی صفت ہے۔ اس کے لئے جس طرح ہر زبان میں الفاظ ہیں اسی طرح عربی زبان میں بھی الفاظ ہیں۔ جہاد کا لفظ بھی اصلاً یہی مفہوم رکھتا ہے۔ کوشش کے لئے عربی میں سعی ایک عام لفظ ہے۔ لیکن جھاد کے لفظ میں مبالغہ کا عنصر شامل ہے۔ یعنی بہت زیادہ کوشش کرنا۔

البتہ یہاں ایک فرق پایا جاتا ہے۔ جب ہم کوشش یا جدو جہد یا اسٹرگل کا لفظ بولیں تو اس میں ثواب یا عبادت کا مفہوم شامل نہیں رہتا۔ لیکن جہا کا لفظ جب اسلامی اصطلاح بنا تو اس میں اصطلاحی طور پر یہ مفہوم بھی شامل ہو گیا۔ یعنی کوشش کے معنی اگر صرف کوشش کے ہیں تو جہاد کا مطلب ایک ایسی کوشش کرنا ہے جو عبادت ہو اور جس میں مشغول ہونے پر انسان کو ثواب حاصل ہوتا ہو جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: **جاھدوا فی اللہ حق جھادہ۔**

جہاد لغت میں

جہاد کی اصل **جُھد** ہے۔ اس کے معنی کوشش کے ہیں مگر جہد کے مادے میں مبالغہ کا مفہوم ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: **جھد اللبن** (کوشش کر کے سارا مکھن نکال لینا) اور **اجھد الدابۃ** (جانور کے اوپر طاقت سے زیادہ لادنا) اسی طرح کہا جاتا ہے **بذل جھدہ** (اس نے اپنی پوری طاقت صرف کی)

اسی طرح کہا جاتا ہے: **لابلغن جھیدای فی الامر** (میں معاملہ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا) جہاد یا مجاہدہ کا مفہوم بھی یہی ہے قرآن میں آیا ہے کہ: **جاھدوا فی اللہ حق جھادہ** (اللہ کے راستہ میں پوری کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے)

مشہور عربی لغت لسان العرب میں بتایا گیا ہے کہ **جھد** کے معنی مبالغہ آمیز کوشش کے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے: **جھدت جھدی واجتھدت رأی ونفسی حتی بلغت مجھودی** (ص: ۱۳۳) یعنی میں نے ہر طرح اپنی پوری کوشش کی یہاں تک کہ میں اپنی آخری کوشش تک پہنچ گیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: **جھد الرجل فی کذا ای جد فیہ وبالغ**۔ (آدمی نے معاملے میں کوشش کی اور اپنی پوری کوشش کر ڈالی) جھاد یا اجتھاد کا مطلب ہے: **بذل الوسع فی طلب الامر** (کسی کام میں اپنی پوری کوشش صرف کرنا)

حالات کی نسبت سے کبھی جھاد یا جدوجھد کا یہ عمل دشمنوں سے مقابلہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت، باعتبار استعمال نہ کہ باعتبار لغت، اس میں محاربہ کا مفہوم بھی شامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امام راغب اصفہانی نے استعمال کی نسبت سے جہاد کی تین قسمیں بتائی ہیں: ظاہری دشمن سے مقابلہ اور شیطان سے مقابلہ اور نفس سے مقابلہ (**والجھاد ثلاثۃ اضرب: مجاھدۃ العدو الظاھر، ومجاھدۃ الشیطان، ومجاھدۃ النفس**)۔

## جہاد قرآن میں

قرآن میں بھی جہاد یا اس کے مشتقات اسی معنی میں آئے ہیں جس معنی میں وہ لغتِ عرب میں استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی کسی مقصد کے لئے مبالغہ آمیز کوشش کرنا۔ لفظ ''جھاد'' قرآن میں چار بار استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ یہ لفظ کوشش اور جدوجھد کے معنی میں ہے نہ کہ براہِ راست طور پر جنگ وقتال کے معنی میں۔

اس سلسلہ میں پہلی قرآنی آیت کا ترجمہ یہ ہے: کہو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس

کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، یہ سب تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے اور اللہ نافرمان لوگوں کو راستہ نہیں دیتا۔ (التوبہ ۲۴)

اس آیت میں اہل اسلام کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ قربانی کی حد تک جا کر اسلام کے دعوتی مشن میں پیغمبر کا ساتھ دیں۔ خواہ اس کام میں ان کے ذاتی مفادات مجروح ہوں یا مال اور تجارت کا نقصان ہو یا جسمانی مشقتیں برداشت کرنی پڑیں، ہر حال میں وہ اس دعوتی مشن میں پیغمبر کے ساتھی بنے رہیں۔ اس آیت میں جہاد فی سبیل اللہ کا لفظ اصلاً پیغمبر کے دعوتی مشن کے لئے آیا ہے نہ کہ جنگ کے لئے۔

قرآن کی دوسری سورہ میں حکم دیا گیا ہے کہ: تم منکرین کی بات نہ مانو اور ان کے ساتھ قرآن کے ذریعہ جہاد کبیر کرو (الفرقان ۵۲) اس آیت میں واضح طور پر جہاد سے مراد دعوتی جہاد ہے۔ کیوں کہ قرآن کے ذریعہ جہاد کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہوسکتا۔ یہ لفظ تیسری جگہ قرآن میں اس طرح آیا ہے: **ان کنتم خرجتم جهادا فی سبیلی وابتغاء مرضاتی** (الممتحنہ ۱) یعنی اگر تم میری راہ میں جہاد اور میری رضا مندی کی طلب کے لئے نکلے ہو۔ یہ آیت فتح مکہ سے کچھ پہلے اتری۔ مدینہ سے مکہ کا سفر جنگ کے لئے نہ تھا۔ وہ دراصل ایک پرامن مارچ تھا جو صلح حدیبیہ کی صورت میں نکلنے والے پرامن نتائج کو حاصل کرنے کے لئے کیا گیا۔ چنانچہ اس موقع پر ایک مسلمان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: **الیوم یوم الملحمة** (آج کا دن لڑائی کا دن ہے) یہ سن کر رسول اللہ نے فرمایا کہ نہیں، آج کا دن رحمت کا دن ہے: **الیوم یوم المرحمة**۔ چوتھی بار قرآن میں یہ لفظ اس طرح آیا ہے: **وجاهدوا فی الله حق جهاده** (الحج ۷۸) یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کا حق ہے۔ اس آیت میں جہاد سے مراد دعوتی جہاد ہے۔ یہ حقیقت اس کے سیاق سے بالکل واضح ہے۔

# حکمتِ اعراض

ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۹ میں لکھتے ہیں: میں نے ہندی اخبار ''ہندستان'' کا شمارہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۹ پڑھا۔ اس کے اداریہ میں یہ لکھا تھا کہ حال میں سورت (گجرات) میں ''گنیش وسرجن'' کا جلوس نکلا۔ اس موقع پر پولیس اور جلوس کے درمیان ٹکراؤ ہوگیا۔ پتھراؤ اور فائرنگ کے نتیجہ میں جلوس کے آٹھ افراد ہلاک اور کئی درجن زخمی ہوگئے۔ یہ جلوس شہر کے مسلم محلّہ کی ایک مسجد کے پاس سے گزر رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مسلم اور ہندو یا مسلم اور پولیس کے درمیان لڑائی ہو جاتی مگر عملاً اس کا الٹا ہوا۔ مسلمانوں نے وہاں پر صبر کا رویہ اپنایا جس کی وجہ سے انھیں اس کا پھل مل گیا۔ اس میں کسی بھی مسلمان کا نقصان نہیں ہوا۔ کیوں کہ ٹکراؤ انتظامیہ اور ہندوؤں کے درمیان ہوا تھا۔ یہ پڑھ کر آپ کی وہ بات یاد آ گئی جو آپ ''الرسالہ'' یا کئی دیگر کتابوں میں لکھ چکے ہیں۔ (سہیل احمد، حسن البنا منزل، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ)

''سورت'' کا یہ واقعہ تمام اخباروں میں آ چکا ہے۔ اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ اس سبق کی طرف الرسالہ میں بار بار نشاندہی کی جاتی رہی ہے۔ وہ یہ کہ ـــــ مسلم کش فسادات کا اصل سبب جلوس کا نکلنا اور اس کا مسلم محلّہ سے گزرنا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ جب جلوس نکلے تو محلّہ والے اس کے مقابلہ میں غیر حکیمانہ رویہ اختیار کریں۔ حکیمانہ رویہ ہمیشہ حفاظت کا ضامن ہوتا ہے اور غیر حکیمانہ رویہ ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے۔

اس معاملہ کا خلاصہ یہ ہے کہ جلوس کے وقت وہاں کے مسلمان اگر منفی ردعمل کا طریقہ اختیار کریں تو مسئلہ مسلم ورسس پولیس بن جائے گا۔ اور اگر وہاں کے مسلمان ایسے موقع پر اعراض کا رویہ اختیار کریں تو سارا مسئلہ جلوس ورسس پولیس بن جائے گا۔ اس اصول کی صداقت بار بار فسادات کی صورت میں سامنے آ چکی ہے۔ سورت کا مذکورہ واقعہ اس حکمت کی ایک مثبت مثال ہے۔

دور اول کے مسلمان مخالفین کی سازشوں اور زیادتیوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ اس

وقت نصیحت کرتے ہوئے ان سے کہا گیا کہ: اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی سازش تم کو نقصان نہ پہنچائے گی۔ (آل عمران ۱۲۰) اب یہ غور کیجئے کہ دشمن کی سازشوں کے مقابلہ میں صبر کس طرح ڈھال بن جاتا ہے۔ اور زیر سازش گروہ کو اس کے نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں جب بھی کوئی ناخوشگوار صورت حال پیش آئے تو اس کے مقابلہ میں ردعمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اشتعال انگیز صورت حال کو دیکھ کر آدمی بھڑک اٹھے اور فوری جذبات کے تحت جوابی کارروائی کرنے لگے۔ اور دوسرا یہ کہ فریق ثانی کی طرف سے اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مشتعل نہ ہو بلکہ اپنے جذبات کو روک کر پورے معاملے پر غور کرے۔ اور اس کے بعد جو کچھ کرے ٹھنڈے ذہن کے تحت سوچ سمجھ کر کرے۔

مذکورہ تقسیم میں پہلی قسم کے ردعمل کا نام غیر صابرانہ ردعمل ہے اور دوسری قسم کے ردعمل کا نام صابرانہ ردعمل۔ دوسرے لفظوں میں اس فرق کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ غیر صابرانہ ردعمل پیش آمدہ صورت حال کا جذباتی جواب (emotional response) ہے۔ اس کے برعکس صابرانہ ردعمل یہ ہے کہ پیش آمدہ صورت حال کے مقابلہ میں جو جوابی کارروائی کی جائے وہ ایک سوچا سمجھا جواب (considered response) ہو۔

صبر کوئی بے عملی نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی کے سامنے کوئی ناپسندیدہ صورت حال پیش آئے تو وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر اعلیٰ ترین بہادری ہے۔ جب ایک آدمی بے صبری کے ساتھ جذباتی اقدام کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ اس کے برعکس جب ایک آدمی صبر والی روش اختیار کرتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کو قابو میں رکھا۔ اس نے اپنے جذبات کو اپنی عقل پر غالب ہونے نہیں دیا۔

# غلط سوچ کا مسئلہ

ماہنامہ الرسالہ کے ایک قاری لکھتے ہیں: آپ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ آدمی کے لئے جب کامیابی کا ایک موقع ختم ہو جائے تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ اس کے بعد دوسرا موقع وہیں اس کے لئے موجود رہتا ہے جس سے وہ اپنی ترقی کا سفر دوبارہ شروع کر سکے۔ سوال یہ ہے کہ آدمی کس طرح جانے کہ یہاں اس کے لئے دوسرا موقع موجود ہے۔ (سہیل احمد، نئی دہلی)

نئے موقع کو پہچاننے کی شرط صرف ایک ہے، وہ یہ کہ آدمی بند ذہن کے تحت نہ سوچے بلکہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ سوچنے کے لئے تیار ہو۔ وہ دوسروں کو قصوروار ٹھہرانے کے مزاج سے اپنے آپ کو اوپر اٹھالے۔ اس کی ایک مثال ہندستان کے مسلمان ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے لیڈر اور ہمارے اخبارات مسلمانوں کو یہ بتاتے تھے کہ ہندستان میں ان کا مقابلہ ہندو اکثریت سے ہے۔ یہاں وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ۱۹۴۷ میں تقسیم کے بعد بھی یہی ذہن باقی رہا۔ تمام بولنے والے اور لکھنے والے لوگ مسلمانوں کو یہی منفی سبق دیتے رہے۔ کچھ لوگ اس حد تک گئے کہ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ یہاں کا اکثریتی فرقہ ہندستانی مسلمانوں کے حق میں اس ملک کو دوسرا اسپین بنانا چاہتا ہے۔

اس غوغا آرائی نے مسلمانوں کے ذہن کو اتنا زیادہ بگاڑا کہ وہ سمجھنے لگے کہ ہندستان میں ان کے لئے کامیابی اور ترقی کے مواقع سرے سے موجود ہی نہیں۔ میں ۱۹۴۷ سے اس کے خلاف لکھتا اور بولتا رہا ہوں۔ آخر کار آزادی کے تقریباً ۴۰ سال بعد مسلمانوں کا ذہن بدلنا شروع ہوا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ ہندستان میں ان کے لئے ہر قسم کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اب یہاں کے مسلمان ہر میدان میں مسلسل ترقی کر رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس دنیا کا نظام فطرت کے قوانین کے تحت چلتا ہے نہ کہ کسی متعصب فرقہ کے منصوبوں یا سازشوں کے تحت۔ کوئی فرقہ یا گروہ بالفرض چاہے بھی تو فطرت اس کے راستہ میں رکاوٹ بن جائے گی اور وہ تاریخ کے پہیہ کو الٹی طرف گھمانے میں کامیاب نہ ہوگا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اس دنیا کا نظام فطرت کے اٹل قانون کے تحت چل رہا ہے نہ کہ کسی گروہ کی سازش کے تحت۔ فطرت کے اس قانون کا ایک حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ وہ اکثر حالات میں کمزور فریق کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ نام نہاد بڑے گروہ کے مقابلہ میں چھوٹے گروہ کی حمایت کرتا ہے۔ یہ قانون قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ (البقرہ ۲۴۹)

ایک کمزور گروہ اپنے مقابلہ میں طاقتور گروہ سے کیوں کر بڑھ جاتا ہے اور فطرت کا قانون کس طرح اس کا مددگار بنتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خالق فطرت نے پیدائشی طور پر ہر انسان کے اندر اتھاہ امکانات رکھ دئے ہیں۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ مگر ابتدائی طور پر یہ صلاحیت سوئی ہوئی حالت میں ہوتی ہے۔ یہ تمام اعلیٰ امکانات اس کے اندر بالقوۃ طور پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ انسان کا اپنا معاملہ ہے کہ وہ اس بالقوۃ (potential) کو بالفعل (actual) میں تبدیل کرے۔

یہاں دوبارہ فطرت کا قانون یہ ہے کہ یہ تبدیلی دباؤ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یعنی کسی فرد یا گروہ کے اوپر حالات کا جتنا زیادہ دباؤ پڑتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کی چھپی ہوئی صلاحیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ عین وہی فطری معاملہ ہے جو، مثال کے طور پر، گنے کے ساتھ پیش آتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہر گنا رس سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ مگر معمول کے حالات میں یہ رس گنے سے باہر نہیں آتا۔ گنے کا رس صرف اس وقت اندر سے نکل کر باہر آتا ہے جب کہ اس پر غیر معمولی دباؤ پڑے۔ گنے کو اگر آپ نرم روئی میں رکھ دیں تو اس کا رس کبھی باہر نہیں آئے گا۔ لیکن جب آپ گنے کو کریشر (crusher) میں ڈالتے ہیں تو اس کے اندر بھرا ہوا میٹھا رس نکل کر باہر آجاتا ہے۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان بھی ہمیشہ دباؤ کے حالات میں ترقی کرتا ہے۔ یہی اصول فرد کے لئے بھی ہے اور یہی اصول جماعت کے لئے بھی۔ اس معاملہ کو مشہور برطانوی مورخ آرنلڈ جے ٹوائن بی نے اپنی کتاب مطالعہ تاریخ (A Study of History) میں کامیابی کے ساتھ واضح کیا

ہے۔ ۱۲ جلدوں کی اس کتاب میں اس نے بتایا ہے کہ تاریخ کی تمام بڑی بڑی تہذیبوں کو جو لوگ وجود میں لائے وہ اقلیت میں تھے۔ یہ دراصل اقلیتی گروہ ہے جو تاریخ کے تمام بڑے بڑے واقعات کے پیچھے کام کرتا رہا ہے۔

ٹوائن بی کے مطابق، اس کا اصول یہ ہے کہ اکثریتی گروہ کی طرف سے اقلیتی گروہ کو چیلنج پیش آتا ہے۔ یہ چیلنج اقلیتی گروہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اکثریتی گروہ کے مقابلہ میں زیادہ کام کرے۔ وہ اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو دوسروں سے زیادہ استعمال کرے۔ حالات کا یہ دباؤ اقلیتی گروہ کو ابھارتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہیروانہ کردار ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ٹوائن بی نے فطرت کے اس اصول کو تاریخ کی اکیس تہذیبوں کی عملی مثال سے ثابت کیا ہے۔

فطرت کا یہی قانون ہندستانی مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ وہ اپنی سیاسی مصلحت کے تحت ملک کے چھوٹے اور بڑے گروہ کے درمیان ایک موازنہ (بیلنس) قائم کئے ہوئے تھے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو جب ہندستان آزاد ہوا اور یہاں جمہوری دور آیا تو انگریز کا قائم کردہ موازنہ ٹوٹ گیا۔ اب مسلمانوں کی حیثیت اقلیتی گروہ کی ہوگئی اور ہندوؤں کی حیثیت اکثریتی گروہ کی۔ اس کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے لئے بہت سے مسائل پیدا ہوگئے جو انگریزوں کے زمانے میں موجود نہ تھے۔

ہندستانی مسلمانوں کے لئے بظاہر یہ ایک مسئلہ تھا۔ مگر فطرت کے قانون کے مطابق وہ ایک چیلنج تھا۔ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کی چھپی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنے کے ہم معنی تھا۔ بیداری کا یہ عمل ابتدائی طور پر ۱۹۴۷ کے بعد ہی شروع ہوگیا تھا۔ مگر اپنے پہلے دور میں وہ غیر شعوری حالت میں عمل کرتا رہا۔ اس کے بعد دوسرا دور آیا اور بیداری کا یہ عمل شعوری طور پر شروع ہوگیا۔ اب یہ عمل اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ ہر جگہ اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے دہلی میں مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع تھا: مسلمانوں کا معاشی پچھڑا پن کیوں؟ یہاں مختلف مقرّرین نے اظہار خیال کیا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ مفروضہ بجائے خود

غلط ہے کہ اس ملک کے مسلمان پچھڑ گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ اصل حقیقت برعکس طور پر یہ ہے کہ اس ملک کے تقریباً ہر مسلمان نے ۱۹۴۷ کے بعد ترقی کی ہے۔ میں نے کہا کہ صنعتی انقلاب کے بعد ساری دنیا میں اور خود ہندستان میں ایک اقتصادی انفجار (economic explosion) آیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ایک قسم کا خلافِ زمانہ قول ہے کہ مسلمانوں کو اقتصادی اعتبار سے پچھڑا ہوا گروہ بتایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا بیان بظاہر ہی قابلِ رد ہے۔

پھر میں نے اپنی تقریر میں حاضرین کو براہ راست خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ جو مسلمان اس ہال کے اندر موجود ہیں، ان میں سے ہر مسلمان کی اقتصادی حالت ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر آپ میں سے کسی کا معاملہ اس سے مختلف ہو تو وہ کھڑا ہو کر میرے اس بیان کی تردید کرے۔ حاضرین میں سے کسی ایک مسلمان نے بھی یہ نہیں کہا کہ ۱۹۴۷ میں میری جو معاشی حالت تھی اس کے مقابلہ میں آج میری حالت خراب ہو چکی ہے۔

میں نے اس معاملہ کا باقاعدہ سروے کیا ہے اور اپنی کتاب ''ہندستانی مسلمان'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق، ہندستان کا تقریباً ہر مسلم ادارہ، ہر مسلم جماعت، ہر مسجد اور ہر مدرسہ ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج دگنا اور چوگنا ترقی کر چکا ہے۔ تقریباً ہر مسلم خاندان ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج زیادہ بہتر زندگی گزار رہا ہے۔ تعلیم اور اقتصادیات کے میدان میں ہندستانی مسلمان ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج بہت زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ یہ ترقی اتنا عام ہو چکی ہے کہ کسی بھی مسلم خاندان کا جائزہ لے کر اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

اس معاملہ کی ایک چشم کشا مثال وہ ہے جو جولائی ۱۹۹۹ میں سامنے آئی۔ نیویارک کے مشہور اقتصادی میگزین فوربس (Forbes) نے ساری دنیا کے ارب پتیوں کا سروے کیا۔ اس سلسلہ میں اس نے ہندستان کے ارب پتیوں کا بھی سروے کیا۔ اس سروے کے نتائج فوربس میگزین کے شمارہ ۵ جولائی ۱۹۹۹ میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد وہ ہندستان کے تمام اخباروں، مثلاً ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس، وغیرہ میں نقل ہوئے۔

فوربس میگزین کے سروے کے مطابق اس وقت ہندستان کے ارب پتیوں (billionaires) میں جو آدمی نمبر ایک پر ہے وہ بنگلور کا ایک مسلمان ہے جس کا نام عظیم ہاشم پریم جی ہے۔ اس کے علاوہ ہندستان کے دس انتہائی بڑے دولت مندوں میں سے تین آدمی مسلمان ہیں۔ انٹیلی جنٹ انوسٹر (Intelligent Investor) کے شمارہ ۱۴ جولائی ۱۹۹۹ میں یہ رپورٹ ایٹ دی ٹاپ (At The Top) کے عنوان سے چھپی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی کے شمارہ ۲۷ جون ۱۹۹۹ میں یہ رپورٹ ویری رچ (Very Rich) کے عنوان سے چھپی ہے۔ دوسرے اخباروں میں یہ رپورٹ رچسٹ انڈین (Richest Indian) وغیرہ عنوانات کے تحت شائع ہوئی ہے۔

# مستقبل کی قیادت

## ایک تاریخی قانون

مشہور انگریز مورخ آرنلڈ ٹوائن بی ۱۸۸۹ میں لندن میں پیدا ہوا اور ۱۹۷۵ میں یارک شائر میں اس کی وفات ہوئی۔ ۳۵ سال کے لمبے مطالعہ کے بعد اس نے اپنی کتاب مطالعۂ تاریخ (A Study of History) لکھی۔ یہ کتاب بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی آخری جلد ۱۹۶۱ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں پوری انسانی تاریخ کی ۲۶ معلوم تہذیبوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور قوموں کے عروج وزوال کا ایک مربوط فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔

آرنلڈ ٹوائن بی اپنے تاریخی مطالعہ کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جب بھی دنیا میں کوئی نئی تہذیب ظہور میں آتی ہے تو اس کے پیچھے کسی اقلیتی گروہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ دراصل اقلیت ہی ہے جو ان فطری اور تاریخی صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے جو کسی نئے تہذیبی انقلاب کو ظہور میں لانے کے لئے ضروری ہے۔ اس قسم کا تخلیقی انقلاب کبھی کسی اکثریتی گروہ کے ذریعہ وجود میں نہیں آیا۔

آرنلڈ ٹوائن بی کے اس تاریخی فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ــــ کسی تہذیب کا ابتدائی مرحلہ ماحول کے چیلنج سے ظہور میں آتا ہے۔ یہ ماحول نہ تو اتنا سخت ہو جو ترقیاتی عمل کو ابھرنے نہ دے اور نہ اتنا موافق ہو کہ وہ تخلیقی روح کو معطل کر دے۔ تخلیقی اقلیت اس چیلنج کا جواب دے کر غیر فعال اکثریت کو قیادت فراہم کرتی ہے۔ چیلنج کا جواب دینے کے اس عمل کو مزید تقویت اقلیت کے پیش کردہ حل کی عمومی قبولیت سے ملتی ہے (جو اس کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے):

> The initial stage of a civilization is its growth, brought about by an environmental challenge, neither too severe to stiffle progress nor too favourable to inhibit creativity. Which finds a response among a creative minority that provides leadership to the passive majority. The mechanism of challenge-response is complemented by the general acceptance of and loyalty to the minority's solutions.

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک میں جو گروہ اقلیت میں ہو اس کو عین قانون فطرت کے تحت

اکثریتی گروہ کی طرف سے چیلنج کا سامنا پیش آتا ہے۔ یہ صورت حال ایک طرف اقلیتی گروہ کی صلاحیتوں کو بیدار کر کے اس کو فعال بناتی ہے۔ دوسری طرف اکثریتی گروہ چیلنج سے محفوظ ہونے کی بنا پر غیر فعال ہوتا چلا جاتا ہے، اس کو وہ مہمیز نہیں ملتی جو اس کی صلاحیتوں کو بیدار کرے۔ یہ صورت حال مکمل طور پر اقلیتی گروہ کے حق میں ہوتی ہے۔ اب اگر اقلیتی گروہ اتنا کمزور نہ ہو کہ حالات کے دباؤ کے تحت وہ کچل کر رہ جائے تو یہی وہ تاریخی گروہ بن جاتا ہے جو نئی تہذیب پیدا کرے اور انسانیت کو ایک نئے اور بہتر مستقبل کی طرف لے جائے۔

## ایک قرآنی آیت

آرنلڈ ٹوائن بی نے جو بات کہی ہے وہ صرف ایک مورخ کا نقطہ نظر نہیں ہے۔ وہ خود فطرت کا ایک اٹل قانون ہے جس کو ایک مورخ نے تاریخ کے مطالعہ کے ذریعہ دریافت کیا ہے۔ فطرت کا یہ قانون قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے... کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے اذن سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (البقرہ ۲۴۹)

How often has a small group prevailed against a large group by the sanction of God. And God is with the people of patience.

اس آیت میں اذن سے مراد فطرت کا وہ قانون ہے جو خدا نے انسانوں کے درمیان ابدی طور پر قائم کر رکھا ہے۔ اس قانون کو قرآن میں دوسری جگہ عسر کے ساتھ یسر اور یسر کے ساتھ عسر (الانشراح) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ زیر بحث موضوع کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس گروہ کو عددی برتری حاصل ہو وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتا ہے کہ محنت کے بغیر ہی اس کو سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔ یہ نفسیات اس کے اندر ذہنی اور عملی جمود پیدا کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ پوری قوم آرام طلبی اور کاہلی کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کے قابل نہیں رہتی۔

اس کے برعکس جو گروہ عددی اور سماجی حیثیت سے اپنے کو کمتر محسوس کرے وہ عین فطری قانون کے تحت زیادہ فعال ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ احساس کہ وہ برتر طاقت کی طرف

سے چیلنج کی زد میں ہے اس کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ محنت کرے۔ وہ اپنے وسائل کو زیادہ بہتر اور زیادہ منظّم طور پر استعمال کرے۔ وہ پیش آمدہ مسائل کا برتر حل (superior solution) دریافت کرے۔ اس قسم کی مسلسل سوچ اس کے اندر وہ چیز پیدا کر دیتی ہے جس کو نفسیاتی علماء دماغی طوفان (brain storming) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اکثریتی فرقہ کے حالات اگر اس کے افراد کو ذہنی جمود میں مبتلا کر دیتے ہیں تو اقلیتی فرقے کے حالات اس کے افراد کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر تاریخ کے تمام بڑے بڑے تہذیبی واقعات ہمیشہ اقلیتی گروہ کے ذریعہ ظہور میں آئے۔ اکثریتی گروہ نے کبھی کوئی بڑا تاریخی واقعہ انجام نہیں دیا۔

## ہندستانی مسلمان

قرآن میں بیان کردہ مذکورہ قانون اور اس کی تاریخی تصدیق پر غور کیجئے تو ایک نہایت اہم حقیقت دریافت ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس حقیقت کا تعلق ہندستانی مسلمانوں سے ہے۔ موجودہ ہندستانی مسلمان اس کا عین مصداق قرار پاتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہندستانی مسلمانو ں کے بارے میں ساری صورت حال اچانک بدلی ہوئی نظر آئے گی۔ وہ قوم جس کا معاملہ آج بظاہر ایک المیہ کی صورت میں دکھائی دیتا ہے وہ اچانک ایک طربیہ نظر آنے لگتا ہے۔ ایک قوم جو آج بظاہر ملک کے لئے ایک بوجھ (liability) سمجھی جارہی ہے، وہ ملک کے لئے ایک قیمتی اثاثہ (asset) کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مزید یہ کہ ہندستانی مسلمانوں کی یہ امید افزا حیثیت صرف ہندستان کے لئے نہیں ہے بلکہ وسیع تر معنوں میں وہ ساری دنیا کے لئے ہے۔

آج کی دنیا کو گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو تمام قوموں میں صرف ہندستانی مسلمان وہ گروہ ہیں جن کے حق میں مذکورہ تاریخی شرطیں پوری ہورہی ہیں۔ وہ یہاں اقلیت میں ہیں مگر اتنی چھوٹی اقلیت نہیں کہ چیلنج کے مقابلہ میں بے بس ہوکر رہ جائیں۔ اقلیت میں ہونے کی بنا پر ایک طرف انھیں

اکثریت کے چیلنج کا سامنا ہے دوسری طرف ان کا ایک بڑی اقلیت ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ اکثریت کے مقابلہ میں یکسر مغلوب ہوکر نہ رہ جائیں۔اس صورت حال نے ہندستان کے مسلمانوں کو بہترین موافق پوزیشن (advantageous position) میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔

## ایک مثال

یہاں میں ایک مثال درج کروں گا جس سے اس معاملہ کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ مثال انڈونیشیا اور ملیشیا کی ہے۔ میں نے اپنے ایک بیرونی سفر کے دوران انڈونیشیا کے ایک سنیئر پروفیسر سے پوچھا کہ انڈونیشیا اور ملیشیا دونوں پڑوسی ملک ہیں مگر ملیشیا کے مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں جو ترقی کی ہے، انڈونیشیا کے مسلمان وہ ترقی نہ کر سکے۔ مذکورہ پروفیسر نے جواب دیا کہ اس کا سبب دونوں کے مختلف حالات میں پایا جاتا ہے۔ ملیشیا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا عددی تناسب تقریباً ففٹی ففٹی کا ہے۔اس بنا پر وہاں مسلسل چیلنج کی حالت قائم رہتی ہے۔ وہاں کے مسلمان ہر وقت یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے غفلت کی تو فریق ثانی آگے بڑھ جائے گا اور وہ ایک پچھڑا ہوا گروہ بن کر رہ جائیں گے۔ یہ نفسیات ملیشیا کے مسلمانوں کو مسلسل متحرک رکھتی ہے۔ان کا زیادہ عمل ان کی ترقی کی ضمانت بن گیا ہے۔

انڈونیشیا کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۹۰ فیصد ہے۔اس عددی اکثریت نے وہاں کے مسلمانوں کے اندر تحفظ کا احساس (sense of security) پیدا کر دیا ہے۔ یہ احساس ان کے لئے جمود کا سبب بن گیا ہے۔ چنانچہ ان کی صلاحیتیں زیادہ بیدار نہ ہوسکیں۔ وہ محنت کش بننے کے بجائے سہولت پسندی کی زندگی کے عادی بن گئے۔اور جس قوم کا یہ حال ہو جائے وہ کبھی کوئی بڑی ترقی نہیں کر سکتی۔

برصغیر ہند میں اگر اس اصول کو منطبق کیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمان گویا انڈونیشی مسلمانوں کے مانند ہیں، اور انڈیا کے مسلمان ملیشیائی مسلمانوں کے مانند..... بلکہ شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انڈیا کے مسلمان اس معاملہ میں ملیشیا کے مسلمانوں سے بھی زیادہ بہتر

پوزیشن میں ہیں۔ کیونکہ ملیشیائی مسلمانوں کو ایک مساوی گروہ کی طرف سے چیلنج درپیش ہے، جب کہ انڈیا کے مسلمانوں کو عددی اعتبار سے ایک برتر گروہ کا سامنا کرتے ہوئے زندگی کا ثبوت دینا ہے۔ اس فرق کی بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انڈیا کے مسلمانوں میں مقابلہ کی اسپرٹ جتنی زیادہ بیدار ہوگی وہ اس سے زیادہ ہوگی جو ملیشیا کے مسلمانوں میں بیدار ہوتی ہے۔

ان حالات کی بنا پر ہندستانی مسلمان ایک عظیم امکان کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ امکان کہ وہ فطرت کے اشارہ کو سمجھیں اور اس کو استعمال کر کے نہ صرف ہندستان کے لئے بلکہ پوری دنیا کے لئے ایک نئے دور کے نقیب بن جائیں۔

## بیسویں صدی کا جائزہ

بیسویں صدی میں دنیا کے نقشہ پر کئی قومیں ابھریں جنھوں نے عالم انسانی کی قیادت کا رول ادا کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے تین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔۔۔ سوویت یونین، امریکہ، ہندستان۔ مگر یہ تمام طاقتیں یا تو عملاً ناکام ہو چکی ہیں یا وہ ناکامی کے کنارے کھڑی ہوئی ہیں۔

۱۹۱۷ میں روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا، اس کے بعد سوویت یونین کی شکل میں اس کا ایک عظیم امپائر بن گیا۔ تقریباً ۷۵ سال تک شان وشوکت دکھانے کے بعد اس کا یہ حال ہوا کہ ۱۹۹۱ میں وہ ریت کے محل کی طرح ٹوٹ کر گر گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نظام سرتاسر غیر فطری بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ خدا نے اس دنیا کا نظام مسابقت (Competition) کے اصول پر قائم کیا ہے۔ مگر کمیونسٹ امپائر نے اس کو ختم کر کے ریاستی کنٹرول کی مصنوعی بنیاد پر زندگی کا نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ نظام اول دن ہی سے قابل عمل نہ تھا۔ کچھ دن تک وہ جبر اور پروپیگنڈہ کے زور پر چلتا رہا۔ اس کے بعد وہ خود اپنی داخلی کمزوری کی بنا پر منہدم ہو گیا۔

امریکی نظام تقریباً دو سو سال سے بدستور ابھی تک چلا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کے ابتدائی دانشوروں نے اس کو صحیح فکری بنیاد یعنی مسابقت کے اصول پر قائم کیا۔ تاہم امریکی نظام میں اول دن سے ایک کمزوری شامل تھی۔ وہ یہ کہ یہ نظام مذہب اور سیاست کی

تفریق کے اصول پر قائم کیا گیا اس قسم کی تفریق اصولی طور پر غلط ہے مگر وہ کم از کم اقتصادی پہلو سے ایک قابل بقا (sustainable) نظام تھا۔ اس لئے وہ ظاہری ڈھانچہ کے اعتبار سے چلتا رہا اور بظاہر اب بھی چلا جا رہا ہے۔

تاہم گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ امریکی نظام اب آہستہ آہستہ زوال کا شکار ہو رہا ہے۔ اس زوال کا نمایاں مظاہرہ ۹۸۔۱۹۹۹ میں موجودہ امریکی صدر بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی (Monica Lewinsky) کے واقعہ کی صورت میں ہوا۔ مونیکا لیونسکی واشنگٹن کے وہائٹ ہاوس کی ایک نوجوان کارکن تھی۔ کلنٹن نے اس سے خفیہ جنسی تعلق قائم کرلیا۔ جب یہ راز افشا ہوگیا تو صدر کلنٹن نے دو اور غلطیاں کیں۔ ایک دروغ حلفی (purjury) اور دوسرے انصاف میں رکاوٹ ڈالنا۔ ۱۳ ماہ تک اسمبلی کی سطح پر کیس چلتا رہا یہاں تک کہ ۱۲؍فروری ۱۹۹۹ کو ممبران کی کثرت رائے سے کلنٹن کو بری کر دیا گیا۔

اس کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ امریکی عوام کی تقریباً ۷۵ فیصد تعداد صدر کلنٹن کے مواخذہ (impeachment) کے خلاف تھی۔ امریکی عوام کی رائے یہ تھی کہ صدر کلنٹن نے امریکی اقتصادیات کو بہتر بنایا ہے ایسی حالت میں اگر ان کی ذاتی زندگی غیر اخلاقی ہو تو ہمارے لئے وہ قابل لحاظ نہیں۔ امریکی عوام کے اس رجحان کی بنا پر صدر کلنٹن کے خلاف مواخذہ کی تحریک ناکام ہوگئی۔

۲۰۰ سال پہلے امریکہ نے سیاست کو مذہب سے جدا کیا تھا۔ اب یہ ثابت ہوا کہ امریکی قوم نے مزید آگے بڑھ کر اخلاقی اقدار (moral values) کو بھی اپنی سیاسی اور قومی زندگی سے الگ کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ یہ دوسری علیحدگی اتنے بڑے پیمانہ پر ہوئی ہے کہ نہ صرف امریکی عوام بلکہ ساری دنیا کے لوگوں نے اس کو جان لیا۔ بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کا یہ قصہ ایک ایسے زمانہ میں پیش آیا جب کہ دنیا میڈیا اور انٹرنٹ کے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ چنانچہ پورے ایک سال تک یہ معاملہ ہر روز لوگوں کے سامنے آتا رہا۔ دنیا میں بسنے والا تقریباً ہر شخص اس کو جان گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ میں اخلاقی اقدار اور سیاست کے درمیان میں یہ جدائی خاموش عمل کے طور پر نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ اعلان اور اشتہار کے ساتھ ہوئی ہے۔ یہ برائی امریکی سماج میں اگر خاموش عمل کے طور پر ہوتی تو وہ امریکہ کے لئے کچھ اور زندگی کی ضمانت بن سکتی تھی جیسا کہ قدیم بادشاہوں کے ساتھ پیش آیا۔ مگر اس کو علی الاعلان اختیار کر کے امریکہ نے اپنے زوال کے سفر کو بہت زیادہ تیز کر دیا ہے۔ کوئی بھی نظام اخلاقی صفات سے محروم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور امریکہ یقینی طور پر اس تاریخی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

تیسری مثال ہندستان کی ہے۔ ہندستان میں تقریباً سو سال کی جدوجہد کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو آزادی آئی۔ سوامی وویکانند نے کہا تھا کہ آزادی کے بعد ہندستان ورلڈ لیڈر بنے گا۔ مگر عملاً کیا ہوا۔ یہ ملک لمبی مدت سے اونچی ذات اور نیچی ذات کے دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ حالات سے فائدہ اٹھا کر اونچی ذات والوں نے آزادی کو ہائی جیک (hijack) کر لیا۔ یہی لوگ آزادی کے بعد سے مسلسل ملک کے اوپر حکومت کر رہے ہیں۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ وہ ملک کو ایسا نظام دینے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں جو مہاتما گاندھی کے الفاظ میں ''ہر آنکھ کے آنسو پوچھنے والا ہو''۔

اس ناکامی کا سبب بالکل واضح ہے۔ ملک کے اونچے طبقہ (upper cast) کے پاس جو آئیڈیالوجی ہے وہ ایک ایسی محدود آئیڈیالوجی ہے جو پوری انسانیت کو اپنے دامن میں نہیں لیتی۔ اس آئیڈیالوجی میں اونچی ذات والوں کے لئے تو باعزت جگہ ہے۔ مگر نیچی ذات اور غریب عوام کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ اس آئیڈیالوجی کے مطابق، ہر آدمی جس حال میں ہے وہ خود اس کی اپنی ہی پچھلی زندگی کا لازمی اور ناقابل تقسیم نتیجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ غریب اور مظلوم ہیں وہ فطرت کے جبری نظام کے تحت خود اپنے ماضی کے کردار کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ انھیں زندگی کے آخری لمحہ تک اس نتیجہ کو بہر حال بھگتنا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی ملک کے نصف سے زیادہ حصہ کو اونچی ذات کے حکمرانوں کی نظر میں ایک ایسا کیس بنا دیتی ہے جس پر رحم کرنا ضروری تو کیا ممکن بھی نہیں۔

پیدائش کے اس جبری نظریہ نے اونچی ذات کے حکمرانوں کو جو آئیڈیالوجی دی وہ ایک محدود آئیڈیالوجی تھی۔ اس محدود آئیڈیالوجی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان حکمرانوں کے دل میں وسیع تر انسانیت کے لئے نرم گوشہ پرورش نہ پاسکا۔ ان کے لئے آزادی صرف اس بات کا موقع بن گئی کہ وہ سب کچھ اپنے لئے جمع کرلیں اور دوسروں کے لئے کچھ نہ چھوڑیں، کیونکہ دوسرے لوگ اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ وہ محروم رہ کر اپنے پچھلے دور حیات کی غلطیوں کی سزا پائیں اور اسی حال میں مرکر وہ اس دنیا سے چلے جائیں۔

## نئے گروہ کی ضرورت

حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آخر میں یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ قیادت کی دعویدار تمام قومیں مکمل طور پر ناکام ہوچکی ہیں۔ اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے کہ ایک نیا اور تازہ دم گروہ ابھرے جو اس خلا کو پر کرے، جو آنے والی اکیسویں صدی کو حقیقی معنوں میں انسان کے لئے ایک نئی اور بہتر صدی بنادے۔

میرے اندازے کے مطابق یہ نیا گروہ ہندستانی مسلمانوں کا گروہ ہے۔ تقریباً ۶۰ مسلم قوموں میں، ہندستانی مسلمان استثنائی طور پر اس خصوصیت کے مالک ہیں کہ وہ انڈونیشیا کو چھوڑ کر سب سے بڑے عددی گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک اکثریتی گروہ کی طرف سے چیلنج کا سامنا کررہے ہیں۔ چیلنج انسانی ترقی کی لازمی شرط ہے، اور یہ شرط اپنی پوری صورت میں موجودہ دور میں صرف ہندستانی مسلمانوں کے حق میں پوری ہورہی ہے۔ موجودہ ہندستانی مسلمان ہی اس حالت میں ہیں کہ قانون فطرت کے تحت ان کے اندر وہ تخلیقی اور تعمیری اوصاف پیدا ہوں جو کسی قوم کو اس دنیا میں قیادت کا اہل بناتے ہیں۔

علامہ اقبال اور مسٹر محمد علی جناح نے غالباً ہندستانی مسلمانوں کو اسی تعمیری رول کے لئے کھڑا کرنا چاہا مگر انھوں نے اس کے لئے جو تدبیر اختیار کی وہ درست نہ تھی۔ انھوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ پاکٹ (پاکستان) بنانا ان کے لئے اس قسم کا موقع دینے والا ثابت ہوگا مگر برعکس طور پر

اس تدبیر نے ان مسلمانوں کو چیلنج کے ماحول سے محروم کر دیا، جب کہ چیلنج کا ماحول ہی کسی بڑے انسانی عمل کے ظہور میں آنے کی لازمی شرط ہے۔

تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان کے کچھ مسلم لیڈروں نے اس سلسلہ میں ایک نیا منصوبہ بنایا۔ انھوں نے چاہا کہ مسلم-دلت اتحاد قائم کریں اور اس طرح مسلمانوں کو زیادہ طاقت ور حیثیت دے کر انھیں اس قابل بنائیں کہ وہ ملک میں کوئی بڑا رول ادا کر سکیں۔ مگر یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی پہلی اور بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ مسلم۔دلت اتحاد کا مقصد صرف مسلمانوں کے لئے تحفظ فراہم کرنا تھا۔ وسیع تر ملکی مفاد اس کا حقیقی نشانہ نہیں تھا۔ اور اس قسم کی محدود اسکیم کسی بھی مشترک سماج میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس دنیا میں وہی منصوبہ کامیاب ہوتا ہے جس میں دوسروں کی خیر خواہی شامل ہو۔ محض اپنی خیر خواہی کی بنیاد پر بنایا ہوا منصوبہ قانون فطرت کے خلاف ہے اس لئے اس کا کامیاب ہونا بھی اس دنیا میں ممکن نہیں۔

## لائحہ عمل

حالات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہندستان میں وہ اسٹیج مکمل طور پر تیار ہو چکا ہے جس کو استعمال کر کے مسلمان اپنا تاریخی رول ادا کر سکیں۔ تاہم کوئی بڑا تاریخی رول صرف اس وقت ادا کرنا ممکن ہوتا ہے جب کہ اس کی تمام ضروری شرائط پوری کی گئی ہوں، شرائط کی تکمیل کے بغیر اسباب کی اس دنیا میں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

## عملی پروگرام

۱۔ میرے نزدیک اس معاملہ میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مسلمان اس پورے معاملہ کو خالص انسانی نقطہ نظر سے دیکھیں۔ وہ جو کچھ کریں عمومی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت کریں۔ اپنی گروہی برتری کا قیام یا اپنے حقوق کا حصول جیسے ذاتی مقاصد کو لے کر اگر کوئی جدوجہد شروع کی گئی تو پیشگی طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کسی بھی مثبت یا قابل لحاظ نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس دنیا میں کسی انسان کی سب سے بڑی طاقت دوسروں کے حق میں خیر خواہی

ہے۔اسی طرح کسی انسان کی سب سے بڑی کمزوری اس کی خودغرضی ہے۔مسلمانوں کے اندر یہ اخلاقی اور روحانی اسپرٹ پیدا کرنا مجوزہ مشن کا سب سے پہلا نکتہ ہوگا۔

۲۔ موجودہ حالات میں دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ بڑے پیمانہ پر ہندو مسلم ڈائیلاگ شروع کیا جائے۔ کھلے ذہن کے تحت تمام فکری اور نظریاتی پہلوؤں پر گفتگو ہو۔ یہ کام مناظرہ کے انداز میں نہیں ہونا چاہیئے بلکہ خالص سائنٹفک انداز میں ہونا چاہیئے، یعنی وہی انداز جو آج بھی مذہب کے سوا دوسرے علمی موضوعات میں جاری ہے۔

۳۔ اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ مسلمان صحتمند مقابلہ کے میدان میں پوری طرح داخل ہوجائیں۔ شکایت اور احتجاج اور مانگ اور مطالبات کے طریقہ کو مکمل طور پر ترک کردیں۔ وہ رعایت حاصل کرکے جینے کے بجائے قابلیت کا ثبوت دے کر ملک میں اپنی جگہ بنائیں۔ تعلیم، تجارت، انڈسٹری، تمام سماجی اداروں اور پروفیشنل شعبوں میں امتیازی لیاقت پیدا کرکے آگے بڑھیں۔

۴۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں اقلیتی گروہ کے لئے جس غلبہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے اس کی لازمی شرط، آیت کے مطابق، صبر ہے۔ قرآن کا یہ بیان حتمی طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ فطرت کے مذکورہ قانون کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ لوگوں کے اندر صبر وتحمل کا مادہ ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پیش آمدہ صورت حال میں فوری ردعمل کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے بلکہ سوچا سمجھا طریقہ اختیار کیا جائے۔ سوچا سمجھا طریقہ اختیار کرنے کے لئے ہمیشہ وقت درکار ہوتا ہے۔ تاکہ آدمی ٹھنڈے ذہن کے ساتھ معاملہ کو سمجھے۔ وہ تحقیق اور مشورہ کے مراحل سے گزر کر کوئی گہری رائے قائم کرے۔ اس طرح صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے اقدام سے بچے اور منصوبہ بند عمل کا طریقہ اختیار کرے۔ جو لوگ مسلمانوں کو مثبت رول ادا کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں ان پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کے اندر صابرانہ مزاج پیدا کریں۔

وہ ان کو جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی کی تعلیم دیں۔

۵۔ کوئی بھی کام کرنے کے لئے اس کے مطابق بنیاد (base) درکار ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں جو رول ادا کرنا ہے اس کے لئے بھی یہی ضروری تیاری درکار ہے۔ اور وہ بنیاد تعلیم اور کردار ہے۔ جو لوگ یہ درد رکھتے ہیں کہ مسلمان اس ملک میں اپنا مطلوب تعمیری کردار ادا کریں انھیں مہم کے انداز میں یہ کوشش شروع کر دینا چاہیئے کہ مسلمان صد فی صد تعلیم یافتہ بن جائیں۔ اس تعلیمی نشانہ کو پورا کئے بغیر آگے کا کام نہیں ہوسکتا۔ اسی کے ساتھ انھیں دوسری مہم یہ جاری کرنا ہے کہ مسلمان اعلیٰ کردار کے حامل بنیں۔ مسجد اور مدرسہ سے لے کر اخبارات ورسائل تک ہر ذریعہ کو اس مقصد کے لئے پوری طرح استعمال کیا جانا چاہیئے۔ تعلیم آدمی کو باشعور بناتی ہے۔ اور اخلاق و کردار کے ذریعہ آدمی اس کا اہل بنتا ہے کہ وہ قابل اعتماد طور پر دنیا کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکے۔

۶۔ آزادی کے بعد ملک میں جو سماج بنا وہ نفرت اور تشدد کا سماج تھا۔ اس منفی فضا میں ملکی تعمیر کا کام نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے مہاتما گاندھی نے آزادی (۱۹۴۷) کے وقت کہا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل کر امن اور ہم آہنگی کے ساتھ رہنا ہوگا۔ ورنہ میں اسی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا:

Hindus and Muslims should learn to live together in peace and amity otherwise I will die in the attempt.

بدقسمتی سے ابھی تک نفرت اور کشیدگی کی یہ فضا ختم نہ ہوسکی۔ یہ فضا ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے اور پورے ملک کے لئے سخت مہلک ہے۔ اس کی موجودگی میں ملک کے اندر کسی تعمیری منصوبہ کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر ممکن کوشش کر کے اس کو ختم کیا جائے۔ ملک میں قومی یک جہتی اور برادرانہ محبت کا ماحول پیدا کیا جائے۔ اس کے بعد ہی یہاں کوئی حقیقی ترقیاتی کام کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس وقت جو تلخی پائی جاتی ہے اس کا بڑا سبب وہ غلط

فہمیاں ہیں جو مذہب کی نسبت سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان غلط فہمیوں کو دور کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے ضرورت ہے کہ وسیع پیمانہ پر اسلام کے صحیح تعارف کی مہم جاری کی جائے۔ مختلف زبانوں میں اسلام کے مختلف موضوعات پر مثبت انداز کی کتابیں لکھ کر انھیں بڑے پیمانہ پر غیر مسلموں کے درمیان پھیلایا جائے۔

۸۔ کوئی قوم صحیح رول صرف اس وقت ادا کرسکتی ہے جب کہ اس کو صحیح قیادت حاصل ہو جائے مگر صحیح قیادت کا تعلق خود قیادت سے زیادہ قبولیت قیادت کی صلاحیت سے ہے۔ قوم کے اندر یہ مزاج ہونا چاہیئے کہ وہ تعمیری قیادت اور استحصالی قیادت کے فرق کو سمجھ سکے۔ وہ حقیقت پسندانہ کلام اور جذباتی کلام کو پہچانے۔ جس قوم میں یہ استعداد نہ ہو وہ ہمیشہ استحصالی قیادت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ مسلم عوام میں یہ مزاج پیدا کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کسی گہرے منصوبہ کے لئے مسلمانوں کو متحرک نہیں کیا جا سکتا۔

۹۔ سیاست کے میدان میں مسلمانوں کا رول اب تک منفی رائے دہندگی (negative voting) کی حد تک رہا ہے۔ یعنی کسی بنا پر جس سے انھیں ناراضگی ہو جائے اس کے خلاف ووٹ دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنا۔ اس قسم کی منفی سیاست نہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے اور نہ ملک کے لئے۔ جمہوریت دراصل طاقت میں اشتراک (power sharing) کی سیاست کا نام ہے۔ ہندستان میں مسلمان مرکزی پارلیمنٹ کی تقریباً ۱۰۰ سیٹوں پر فیصلہ کن بن سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر وہ اپنے ووٹ کو درست طور پر استعمال کریں تو ملک کے سیاسی نظام میں وہ فیصلہ کن تعمیری رول ادا کرسکتے ہیں۔ مگر ابھی تک یہ ممکن نہ ہوسکا۔ ضرورت ہے کہ ان کے اندر صحیح سیاسی شعور پیدا کیا جائے تاکہ وہ جذباتی سیاست کے بجائے تعمیری سیاست کا طریقہ اختیار کرسکیں اور یہاں کے سیاسی مواقع کو مفید طور پر استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں۔

۱۰۔ مسلمانوں کو اس ملک میں مثبت سیاست کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ حالات کے اعتبار

سے اس کی ایک ابتدائی تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ وہملک کے سنجیدہ افراد اور صالح عناصر کو لے کر ایک تعمیری محاذ بنانے کی کوشش کریں۔ اس محاذ کا مقصد اپنے حقوق کا حصول نہیں ہوگا بلکہ یہ ہوگا کہ وہ ملک کی عمومی تعمیر میں اپنا مثبت رول زیادہ مضبوط اور مستحکم طور پر ادا کرسکیں۔ اگر حقیقی معنوں میں اس قسم کا تعمیری محاذ بن جائے تو اس میں مختلف فرقوں کے سنجیدہ عناصر شامل ہوجائیں گے۔ حتی کہ ایک وقت آسکتا ہے جب کہ یہ محاذ تعمیر نو کے بارے میں پورے ملک کی امیدوں کی علامت بن جائے۔ یہ کام اگر خالص تعمیری انداز میں کیا جائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت یہ محاذ ملک میں وہ خلا پر کرنے کے قابل ہوجائے جس کو صالح قیادت کا خلا کہا جاتا ہے۔

# مظفرنگر کا سفر

سرسید ڈے ۱۹۹۴ کے موقع پر علی گڑھ یونیورسٹی ایسوسی ایشن کی مظفرنگر یونٹ نے روایتی ڈنر کے ساتھ ایک سیمنار منعقد کیا۔ اس کا موضوع تھا: مسلمانوں کے لئے ریزرویشن اور ایجوکیشن۔ یہ سیمنار ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۴ کو مظفرنگر کے سعادت ہوسٹل میں ہوا۔ مجھ کو بطور چیف گیسٹ اس میں بلایا گیا تھا۔ سید شمیم حیدر زیدی اس کے پریسیڈنٹ اور راؤ عبدالحمید خاں اس کے سکریٹری ہیں۔

۲۳ اکتوبر کی دوپہر کو بذریعہ کار دہلی سے مظفرنگر کے لئے روانگی ہوئی۔ مظفرنگر کے دو صاحبان میرے ساتھ تھے ـــــ جناب رشید احمد صاحب اور جناب اجمل الرحمٰن صاحب۔ دہلی کی پرہجوم سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم یوپی کے مغربی علاقہ میں داخل ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ سڑک کے دونوں طرف مسلسل سرسبز مناظر ہمارا استقبال کر رہے ہیں۔ اتنی زیادہ سرسبزی مشرقی یوپی میں نظر نہیں آتی۔

اس سرسبزی کا راز کیا ہے۔ اس کا راز اس علاقہ میں آبپاشی کا خصوصی نظام ہے۔ مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک مقام پر پہنچے جہاں ایک ''ندی'' کے اوپر پل بنا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ یہ کون سی ندی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ندی نہیں ہے بلکہ وہ نہر ہے جس کو اپر گنگا کینال کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، گنگا ہمالیہ کی وادی سے نکلتی ہے اور بنگلہ دیش سے گزرتی ہوئی خلیج بنگال میں جا گرتی ہے۔ اس کی لمبائی ۲۵۰۰ کیلومیٹر سے کچھ زیادہ ہے۔ گنگا کے پانی کو، دو ہزار سال سے بھی زیادہ مدت سے آبپاشی کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ مگر مسلم سلطنت کے زمانہ میں بارہویں صدی عیسوی کے بعد اس آبپاشی کو بہت زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔ مغل بادشاہوں نے گنگا ندی سے کئی نہریں نکالیں۔ انسائکلو پیڈیا بریٹانیکا کا بیان ہے:

Irrigation was highly developed during the period of Muslim rule

from the 12th century onward, and the Mughal kings later constructed several canals. (7/881)

اس نہری نظام کو انگریزوں نے مزید ترقی دی۔ انھوں نے اپر گنگا کینال بنائی۔ ذیلی نہروں کو ملا کر اس کی لمبائی ۵۹۵۰ میل ہے۔ وہ ہر دوار سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا افتتاح ۱۸۵۶ میں ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ انگریزوں نے لور گنگا کینال بنائی جو اپنی ذیلی نہروں کے ساتھ ۵۱۲۰ میل لمبی ہے۔ وہ ۱۸۸۰ میں شروع کی گئی۔ ان نہروں نے اس علاقہ میں زرعی انقلاب برپا کر دیا۔

انگریزوں نے ہندستان میں اس طرح کے بہت سے تعمیری کام کئے۔ مگر اپنی نوجوانی کی عمر میں مجھے انگریزوں کے بارہ میں ہمیشہ صرف بری باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ ان کی اچھی باتیں بعد کو صرف ذاتی مطالعہ کے ذریعہ مجھے معلوم ہوئیں۔ خبر رسانی کا یہی یک طرفہ طریقہ ہے جس نے تمام لوگوں کے ذہن کو موجودہ زمانہ میں منفی سوچ میں مبتلا کر دیا ہے۔

راستہ میں میرٹھ آیا جو تقریباً دہلی اور مظفر نگر کے درمیان ہے۔ میرٹھ کا ایک قصہ یاد آیا جو حیات اللہ انصاری صاحب کے ایک مضمون مطبوعہ قومی آواز ۱۳ اگست ۱۹۹۴ میں چھپا تھا۔

میرٹھ میں ایک قاضی نجم الدین صاحب تھے۔ آزادی سے پہلے کے دور میں میرٹھ کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے ایک بار شہر کے صاحب جائداد لوگوں کو بلا کر کہا کہ کانگریس یہ چاہتی ہے کہ میرٹھ میں وہ اپنی شاخ قائم کرے۔ حکومت کی خواہش ہے کہ آپ میں سے کوئی صاحب دفتر قائم کرنے کے لئے اس کو اپنا مکان کرایہ پر نہ دیں۔ انگریز افسر نے سب سے وعدہ لیا کہ ہاں، ایسا ہی کیا جائے گا۔ قاضی نجم الدین صاحب کی باری آئی تو انھوں نے کہا: میں سرکاری حکم کی پابندی کروں گا اور کانگریس کو اپنا مکان ہرگز کرایہ پر نہیں دوں گا۔ البتہ بلا کرایہ کے اسے دے دوں گا۔ چنانچہ کانگریس کا دفتر قاضی نجم الدین کے گھر میں لمبے عرصہ تک رہا۔ مولانا آزاد اکثر وہاں آکر مقیم ہوا کرتے تھے۔ موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو بھی وہاں آتے رہتے تھے۔ قاضی صاحب کے گھر پر کئی بار چھاپے پڑے اور تلاشیاں ہوئیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے مسلمان ملک کے سیاسی عمل میں کتنا زیادہ شامل تھے، اس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے۔

اسی میرٹھ میں مولانا اسماعیل میرٹھی (۱۹۱۷۔ ۱۸۸۴) پیدا ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا اسماعیل میرٹھی اردو کے بہترین مصلح شاعر تھے۔ برٹش دور میں جب کہ لوگ ''مشکلات'' کا انکشاف کر کے لیڈری حاصل کر رہے تھے، مولانا حالی نے ''امکانات'' کی نشاندہی کی۔ اسی طرح مولانا اسماعیل میرٹھی نے قومی ترقی کے لئے سیرت و کردار کی اہمیت کو واضح کیا۔ اگر حالی اور میرٹھی کا کلام مسلمانوں میں پھیلا ہوتا تو اس کے غیر معمولی نتائج نکلتے۔ مگر بدقسمتی سے مسلمانوں میں اقبال جیسے شاعر زیادہ مقبول ہوئے، جنھوں نے مسلمانوں میں فخر اور جذباتیت کا مزاج پیدا کیا۔ جب کہ ضرورت تھی کہ ان کے اندر تعلیم اور تعمیر کا مزاج پیدا کیا جائے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں غیر حقیقت پسندی کا مزاج زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہے۔ مزید یہ کہ اس دنیا میں چوں کہ خیالی بلند پروازی سے کام نہیں چلتا اس لئے لوگ ڈبل اسٹینڈرڈ بن رہے ہیں۔ ملت کے اسٹیج پر تو وہ ''تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں'' اور ''بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق'' جیسے پر جوش الفاظ بول کر حاضرین کی داد لیتے ہیں لیکن وہ اپنے ذاتی معاملات کو ہمیشہ حقیقت پسندانہ انداز میں حل کرتے ہیں۔

راستہ میں دوپہر کا کھانا چیتل گرینڈ (Cheetal Grand) میں کھایا۔ گرد آلود سڑکوں سے گزرتی ہوئی ہماری گاڑی کھتولی پہنچی۔ یہاں وہ ایک موڑ پر مڑ کر ایک گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ اچانک ہمارے سامنے ایک سرسبز نخلستان موجود تھا۔ یہ ہوٹل چیتل گرینڈ کا وسیع کیمپس تھا۔ دہلی — مسوری روڈ پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں ہر وقت لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اس ہوٹل کے مالک ایک مسلمان ہیں۔ لیکن گاہکوں میں ۹۹ فیصد ہندو ہوتے ہیں۔

چیتل گرینڈ والوں کو ابتداء ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے خلاف فرقہ

وارانہ پروپیگنڈا کیا گیا۔ ان کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کے خلاف سازشیں کی گئیں۔ مگر حکمت اور دانش مندی سے ہر چیز کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے ہوٹل کو کامیابی کے اعلیٰ درجہ تک پہنچا دیا۔

ہر قسم کی مخالفتوں کے باوجود ان کی کامیابی کا خاص راز ان کا معیار اور کوالٹی ہے۔ یہاں کی ہر چیز صفائی اور عمدگی کے اعلیٰ معیار پر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سڑک سے گزرنے والے لوگ بڑی تعداد میں یہاں آتے ہیں۔ ان میں بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو دہرہ دون، ہردوار اور رشی کیش وغیرہ مذہبی مقامات پر جانے کے لئے ادھر سے گزرتے ہیں۔ ہم جب ہوٹل کے کیمپس میں داخل ہوئے تو وہاں کاروں اور ٹورسٹ بسوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

ہماری گاڑی کے ڈرائیور ایک سردار جی تھے۔ وہ پوری مہارت کے ساتھ سفید ایمبیسڈر دوڑا رہے تھے۔ وہ ہر گاڑی کو اپنے پیچھے چھوڑتے چلے جا رہے تھے۔ دہلی سے مظفر نگر تک جو گاڑی بھی انھیں اپنے آگے جاتے ہوئے دکھائی دی، اس کو چند منٹ میں انھوں نے پیچھے کر دیا۔

اپنی عادت کے مطابق، میں نے سردار جی سے کچھ سوالات کئے۔ مگر انھوں نے بس ایک دو لفظ میں مختصر جواب دیا۔ چنانچہ میں نے ان سے مزید سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ تاہم اس تجربہ سے میں نے جان لیا کہ وہ اتنے کامیاب ڈرائیور کیوں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا پورا دھیان صرف ایک کام پر دیتے ہیں۔ ذہن کی یہی یکسوئی (concentration) کسی بھی چیز میں اعلیٰ کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

دہلی سے باہر آنے کے بعد ہمارا راستہ زیادہ تر گرینڈ ٹرنک روڈ کے ذریعہ طے ہوا۔ یہ سڑک شیر شاہ سوری نے اپنے زمانہ حکومت (۱۵۴۵-۱۵۴۰) میں بنوائی تھی۔ وہ مشرقی بنگال سے دریائے سندھ تک چلی گئی تھی اور ۱۵۰۰ کوس لمبی تھی۔ شیر شاہ سوری غیر معمولی قسم کا مدبر بادشاہ تھا۔ اس کی تعریف تمام ملکی اور غیر ملکی مورخین نے کی ہے۔ اس نے صرف پانچ سال تک حکومت کی اور اس

قلیل مدت میں اتنے زیادہ رفاہی کام کئے جو کسی بھی دوسرے ہندستانی حکمراں نے نہیں کئے۔

تاہم اس کے اندر ایک کمزوری تھی وہ ضرورت سے زیادہ باحوصلہ (over-ambitious) آدمی تھا۔ وہ شیر شاہ بننے پر راضی نہ تھا بلکہ شہنشاہ ہند بننا چاہتا تھا۔ اس بنا پر اس کا ٹکراؤ ہمایوں بادشاہ سے ہوگیا۔ اس ٹکراؤ کا غیر معمولی نقصان دونوں کو ہوا۔ اگر ہمایوں اور شیر شاہ میں مصالحت ہو جاتی تو شاید ہندستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ باحوصلہ ہونا اچھا ہے، مگر ضرورت سے زیادہ با حوصلہ ہونا اتنا ہی زیادہ برا ہے۔

ہماری گاڑی مظفر نگر میں داخل ہونے والی تھی کہ میرے ساتھی نے سڑک کے کنارے واقع ایک بڑے مکان کی طرف اشارہ کیا جس کا نام کہکشاں منزل ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ کوٹھی نواب زادہ لیاقت علی خاں (۱۹۵۱۔ ۱۸۹۵) نے یہاں بنائی تھی۔ وہ کرنال (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ پھر وہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم بنے اور ان کو قائد ملت کا خطاب دیا گیا۔ اب ایک اور شخص نے اس مکان کو خرید لیا ہے اور اس کا نام رتن دیپ رکھ دیا ہے۔

نواب زادہ لیاقت علی خان جیسے ہزاروں لوگ ہیں جو ہندستان میں بہت اچھی حالت میں تھے۔ اس کے باوجود وہ لوگ تقسیم کے وقت ہندستان کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ یہ ترک وطن رومانی تصورات کے تحت تھا۔ مگر نتائج بتاتے ہیں کہ وہ حقیقت پسندانہ نہیں تھا۔ خود نواب زادہ لیاقت علی خاں، دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح وہاں قتل کر دئے گئے۔ اب وہاں مہاجروں کا جو حال ہے وہ ایک ایسا معلوم واقعہ ہے جس کی بابت یہاں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

مظفر نگر میں داخل ہو کر ہماری گاڑی ایک سڑک پر مڑی۔ وہ چلتی ہوئی ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ اس پر لکھا ہوا تھا: گلزار ابراہیم۔ یہ جناب عقیل احمد صاحب کا مکان تھا۔ ان کے والد کا نام ابراہیم تھا۔ اسی پر انھوں نے اپنے مکان کا نام گلزار ابراہیم رکھا ہے۔

عقیل احمد صاحب اور ان کے دو بھائی الگ الگ بھی ہیں اور ایک ساتھ بھی۔ ان کے درمیان

مثالی اتحاد پایا جاتا ہے۔ اسی لئے یہ لوگ ہر پہلو سے ترقی کر رہے ہیں اور مظفر نگر کے مسلمانوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں کے خاندانی اتحاد کا راز کیا ہے۔ عقیل احمد صاحب نے جواب دیا: ہم تینوں بھائیوں کا حال یہ ہے کہ کوئی چیز ہوتی ہے تو کوئی بھی اس کو خود لینے کی کوشش نہیں کرتا۔ ہر ایک دوسرے سے کہتا ہے کہ تم اسے لے لو۔

یہی مزاج اتحاد و ترقی کی جان ہے۔ جو لوگ لینے کے بجائے دینے کا مزاج رکھتے ہوں ان کے اتحاد و ترقی میں کبھی کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

''گلزار ابراھیم'' میں پہلے سے جناب شاہد صدیقی (اڈیٹر نئی دنیا) اور پروفیسر اقبال حسین (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) موجود تھے۔ ان سے ملی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں تھنک ٹینک (Think Tank) کی بہت اہمیت ہے۔ ہندو صاحبان چنتک منڈل قائم کر کے یہ مقصد حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں بھی ایک مسلم تھنک ٹینک بنانا چاہئے۔ ان لوگوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ طے ہوا کہ جلد ہی انشاء اللہ محدود افراد پر مشتمل ایک مسلم تھنک ٹینک قائم کیا جائے گا۔

مظفر نگر کی سڑکوں پر ہر جگہ کافی بھیڑ دکھائی دی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ شہر اقتصادی سرگرمیوں کا شہر ہے۔ لیکن پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان سرگرمیوں میں زیادہ حصہ ہندوؤں کا ہے۔ مسلمان یہاں کی اقتصادی سرگرمیوں میں شریک ہیں تو وہ بھی دوسرے درجہ کی حیثیت سے۔ تقریباً یہی حالت دوسرے مقامات کی بھی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ مسلمان ابھی جدید اقتصادیات کی اہمیت کو نہیں سمجھے۔ عجیب بات ہے کہ سرسید نے جب علی گڈھ کالج (موجودہ یونیورسٹی) قائم کیا تو ایک عرصہ تک اس میں کامرس کا شعبہ موجود نہ تھا۔ اقتصادی شعور میں مسلمانوں کے اس پچھڑے پن کا اثر آج تک باقی ہے۔

مظفر نگر یوپی کا ایک شہر ہے۔ وہ دہلی کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ دہلی سے بذریعہ کار تقریباً تین گھنٹہ کا راستہ ہے۔ ایک مغل حاکم خانِ جہاں نے ۱۶۳۳ میں اس کو آباد کیا اور اپنے باپ مظفر خاں

کے نام پر اس کا نام مظفر نگر رکھا۔ مظفر نگر شہر کی آبادی تقریباً ڈھائی لاکھ ہے۔ اس میں تقریباً ۳۳ فیصد مسلمان ہیں۔

مظفر نگر ضلع ہی میں قصبہ پھلت ہے جہاں شاہ ولی اللہ صاحب ۴ شوال ۱۱۱۴ھ کو پیدا ہوئے۔ پھلت شاہ صاحب کا ننہال تھا۔ پھلت میں مولانا محمد کلیم صدیقی نے امام ولی اللہ معہد التربیۃ الاسلامیۃ کے نام سے ایک تعلیمی اور دعوتی ادارہ قائم کیا ہے۔ خاص طور پر دعوتی میدان میں وہ خاموشی کے ساتھ مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ ارمغان شاہ ولی اللہ کے نام سے نکل رہا ہے۔

آج شاہ ولی اللہ دہلوی کا نام ہندستانی علماء میں ممتاز ترین نام کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ہندستان میں قرآن وحدیث کے علم کو زندہ کیا۔ آج بھی شاہ ولی اللہ صاحب کا فارسی ترجمہ قرآن کا بہترین ترجمہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب شاہ ولی اللہ زندہ تھے تو ان کے ہم عصر مسلمانوں نے ان کے اوپر قاتلانہ حملہ کیا۔ چنانچہ انھیں روپوش ہو جانا پڑا۔ انقلابی مصلح ہمیشہ اپنے ہم عصروں میں غیر مقبول ہوتا ہے مگر بعد کو وہ لوگوں کی نظر میں ہیرو بن جاتا ہے۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ بابری مسجد کی تحریک پر آپ مسلم قیادت سے جدا ہو گئے۔ میں نے کہا کہ یہ سراسر الزام ہے۔ مسجد کی اصل حیثیت کے بارے میں دوسروں سے میرا کوئی اختلاف نہیں تھا۔ دونوں میں جو فرق تھا وہ صرف یہ کہ میں یہ چاہتا تھا کہ بابری مسجد کے مسئلہ کو غیر مظاہراتی انداز میں حل کیا جائے۔ جب کہ دوسرے مسلم رہنماؤں نے معاملہ کی نزاکت کو نہیں سمجھا۔ انھوں نے اس کو غیر ضروری طور پر ایک مظاہراتی اشو بنا دیا۔ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ سراسر نادانی تھی۔ اور وہ ساری مصیبتیں اسی نادانی کی قیمت ہیں جو بعد کو ہمیں پیش آئیں۔

مظفر نگر کے بارہ میں ہندو مسلم فساد کی ایک خبر دہلی کے بعض اردو اخبارات میں ستمبر ۱۹۹۴ میں چھپی تھی۔ میں نے مظفر نگر پہنچ کر اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہاں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

تصویر کے لئے

اس زمانہ میں ذہن کو بگاڑنے کا کام سب سے زیادہ اخبارات کررہے ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کالجوں کو قتل گاہ بتایا تھا۔ اکبرالہ آبادی نے کہا تھا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

مگر موجودہ زمانہ میں ذہنی قتل کا سب سے بڑا ادارہ خود ہماری صحافت ہے۔ یہ صحافت، خاص طور پر اردو ہفت روزے تو گویا ذہن کو بگاڑنے کے کارخانے ہیں۔

اسی مہینہ اکتوبر کے شروع میں مظفرنگر کو اخباروں کے پہلے صفحہ پر جگہ ملی تھی۔ اس کا سبب ۲ اکتوبر ۱۹۹۴ کو مظفرنگر کے قریب ہونے والا وہ واقعہ تھا جس میں بہت سے نوجوان مرے اور بہت سے زخمی ہوئے۔

انڈیا کا اتری علاقہ پہاڑی علاقہ ہے۔ اس علاقہ کے لوگوں میں یہ تحریک ابھری ہے کہ اترا کھنڈ کے نام سے اس علاقہ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔ علاقہ کے لوگ ۱۲ اکتوبر کو ۲۶ بسوں کے قافلہ کی صورت میں روانہ ہوئے تاکہ دہلی پہنچ کر اترا کھنڈ ریلی میں شریک ہوں۔ یوپی گورنمنٹ کے آڈر کے تحت پولیس اور پی اے سی نے مظفرنگر کے پاس ان بسوں کو روک لیا۔ اس کے نتیجہ میں پولیس اور اترا کھنڈ حامیوں کے درمیان تصادم ہوا۔ پولیس نے نہایت سخت رویہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ گولی چلائی۔ اس حادثہ کے بعد علاقہ کے کئی شہروں میں تشدد پھیل گیا۔

دی پانیئر (۱۶ اکتوبر ۱۹۹۴) میں مسٹر وی ایم بادولا کا اس پر ایک معلوماتی جائزہ چھپا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ اترا کھنڈ مومنٹ ایک بے لیڈر اور بے پتورا (leaderless, rudderless) تحریک ہے۔ اس کی حقیقت سسٹم کے خلاف اندھے غصہ (blind anger against the system) سے زیادہ نہیں۔ اس قسم کی جذباتی تحریکیں صرف تباہی پر ختم ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے اکثر سیاسی تحریکوں کی نوعیت یہی ہے۔ سیاسی تبدیلی کی تحریک چلانا ایک بے حد نازک کام ہے۔ اس کام کے لئے صرف انھی سنجیدہ لوگوں کو اٹھنا چاہئے جو فی الواقع اس کی استعداد رکھتے ہوں اور وہ ایک لیڈر کی اطاعت بھی کر سکتے ہوں۔ جو تحریک بے لیڈر ہو یا اس کے کئی لیڈر ہوں وہ اپنے انجام کے اعتبار سے خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایک صاحب جوش وخروش کے ساتھ مسلمانوں کے لئے سروسوں میں ریزرویشن کی حمایت کررہے تھے۔ میں نے کہا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ سرسید کی تعلیمی تحریک کے نتیجہ میں جب مسلمان سرکاری ملازمتوں میں لئے جانے لگے تو اکبرالہٰ آبادی (۱۹۲۱۔۱۸۴۶) نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا:

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوۃ ہے نہ حج ہے تو خوشی پھر اس میں کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

آج جب تبلیغی جماعت جیسی تحریکوں کی کوشش سے نماز روزہ کی کثرت ہوگئی تو مسلمان مقررین اس کا شکوہ کررہے ہیں کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو نہیں لیا جاتا۔ میں نے کہا کہ ملازمتوں کا تعلق رزرویشن سے نہیں ہے بلکہ محنت اور لیاقت سے ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ غیر مسلموں سے تعلقات بڑھا رہے ہیں، اس سے کیا ملی فائدہ حاصل ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا خاص مقصد باہمی غلط فہمی کو دور کرنا ہے اور اسلام کی صحیح تصویر سے انھیں روشناس کرانا ہے۔ یہ فائدہ خدا کے فضل سے برابر حاصل ہورہا ہے۔ اس سلسلہ کی مختلف مثالوں میں سے ایک مثال خبرنامہ ہے۔ الرسالہ میں ہر ماہ جو خبرنامہ چھپتا ہے اس کو آپ دیکھئے۔ پچھلے چند سالوں میں اتنے زیادہ انٹرویو میڈیا کی طرف سے اسلام پر لئے گئے ہیں جو ۱۹۴۷ سے اب تک کسی کے ذریعہ نہیں ہوئے تھے۔ غیر مسلموں کے اجتماعات میں تقریر کے مواقع، غیر مسلم جرائد میں اسلام کے موضوعات پر مضامین کی اشاعت، اور اس طرح کی دوسری چیزیں اس کے علاوہ ہیں۔

۱۹۸۶ تک بابری مسجد کا مسئلہ صرف ایک مقامی مسئلہ تھا۔ عدالت کے پرامن دائرہ میں اس پر کارروائی ہورہی تھی۔ اس وقت صرف تھوڑے سے ہندو اس سے وابستہ تھے۔ حتی کہ خود اجودھیا کی ہندو اکثریت اس سے الگ تھی۔ مگر جب ملکی سطح پر اس کے لئے جلسہ جلوس کے ہنگامے کھڑے کئے گئے تو ہندو فرقہ بھی جاگ اٹھا۔ اس طرح جو معاملہ ابتداء صرف اجودھیا کے چند ہندوؤں کا مسئلہ تھا وہ پورے ملک کے ہندوؤں کا مسئلہ بن گیا۔ نام نہاد لیڈروں کی یہی الٹی سیاست ہے جس نے مسجد کو

گرانے کے حالات پیدا کئے۔ اسلامی شریعت کے مطابق، ہندو لیڈر شپ اگر مسجد کو گرانے کی ذمہ دار ہے تو مسلم لیڈر شپ اس کو گروانے کی ذمہ دار ہے۔

مغرب سے کچھ پہلے اجتماع گاہ کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں مظفر نگر کے مختلف علاقوں کو دیکھا۔ ساتھیوں سے شہر کے بارہ میں ضروری معلومات حاصل کیں۔

۲۳ اکتوبر کی شام کو مغرب کی نماز اجتماع گاہ کے قریب شیعہ مسجد میں پڑھی۔ ہم لوگوں نے مسجد کے صحن میں اپنی جماعت کی، ہماری نماز جب ختم ہوگئی اور افق پر کسی قدر اندھیرا محسوس ہونے لگا، اس وقت پیچھے سے اذان جیسی آواز آئی۔ ایک شیعہ مؤذن اوپر چڑھ کر اپنی اذان دے رہے تھے۔ ان کے الفاظ سنی اذان سے کسی قدر مختلف تھے۔

نمازِ مغرب کے بعد سیمنار کی کارروائی شروع ہوئی۔ اس کا موضوع، مطبوعہ کارڈ کے مطابق یہ تھا: مسلمانوں کا رزرویشن اور تعلیم:

Muslims' reservation and education

مقررین کے نام یہ ہیں ـــــ ایس نذر محمد زیدی ایڈوکیٹ، مسٹر اجمل الرحمٰن، مسٹر شاہد صدیقی، پروفیسر اقبال حسین، ڈاکٹر ایس یو خان، حاجی عقیل احمد۔

میں نے چیف گیسٹ کی حیثیت سے سب سے آخر میں تقریر کی۔ پہلے میں نے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ میں نے کہا کہ زمانہ رسالت میں مدینہ میں جو سب سے پہلا اسکول کھولا گیا اس کے تمام ٹیچر مشرک تھے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اس سنت کی خلاف ورزی کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم اپنے بچوں کو صرف مسلم اسکول میں پڑھائیں گے۔ ہندو اسکول اور کرسچین اسکول میں اپنے بچوں کو نہیں بھیجیں گے۔ اسی پالیسی پر مسلمان تقریباً سو سال تک چلتے رہے۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس نے موجودہ مسلمانوں کو تعلیم میں پیچھے کر دیا۔

اب جو لوگ رزرویشن کی بات کر رہے ہیں وہ گویا اپنی غلطی کی قیمت دوسروں سے وصول کرنا چاہتے ہیں، مگر اسباب کی اس دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے مسلم لیڈر بار بار یہ غلطی کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی شوشہ والی بات میں الجھا دیتے ہیں۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی، اردو، مسلم پرسنل لا، معاہداتی سیاست، بابری مسجد، وغیرہ۔ اب اسی قسم کا نیا شوشہ رزرویشن کی صورت میں نکالا گیا ہے۔ یہ ہمارا اصل اشو نہیں ہے۔ یہ اشو کو چھوڑ کر نان اشو میں قوم کو الجھانا ہے۔ اس قسم کی سیاست کو ہمیں چھوڑنا پڑے گا ورنہ ہم کبھی ترقی کا درجہ حاصل نہ کر سکیں گے۔

سیمنار کے بعد ''سرسید ڈنر'' ہوا۔ لوگوں نے بڑی دھوم سے کھایا۔ میں تو سادہ کھانا کھانے کا عادی ہوں۔ اس لئے میں نے اس پروگرام میں نیم دلانہ شرکت کی، زیادہ پرجوش طور پر میں اس میں شریک نہ ہو سکا۔

ایک صاحب نے جنگ جویانہ انداز میں کہا: آپ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے بابری مسجد کے معاملہ میں ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیا۔ مسلمانوں نے کب ٹکراؤ کیا۔ وہ تو چپ چاپ اپنے گھروں میں بیٹھے رہے۔ انھوں نے ہمارے گھروں میں گھس کر ہمارے ساتھ ظلم کیا۔

میں نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف یہ کہا کہ آپ اس وقت جس انداز میں بول رہے ہیں اسی کا نام ٹکراؤ ہے۔ آپ تو خود ہی اپنے عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ ہم میں ایسے لوگ ہیں جو غیر ضروری طور پر ٹکراؤ کر بیٹھتے ہیں اور اس کے بعد وہ فساد پیدا ہوتا ہے جس کا نتیجہ تمام لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

یہ سیمنار علی گڈھ کے اولڈ بوائز کی طرف سے کیا گیا تھا۔ ایک صاحب نے ایک مطبوعہ کاغذ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹاف ایسوسی ایشن کی جنرل باڈی کی ایک خصوصی میٹنگ ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۴ کو علی گڈھ میں ہوئی۔ اس میں متفقہ طور پر ایک رزولیشن پاس ہوا جو ڈاکٹر مظفر حسین صدیقی (آنریری سکریٹری) کے دستخط سے پریس کو برائے اشاعت بھیجا گیا ہے۔

اس رزولیشن میں کہا گیا ہے کہ یونیورسٹی کیمپس کی حالت انتہائی حد تک بگڑ چکی ہے۔

لاقانونیت اور کرپشن عام ہے۔طلبہ کا کیریر سخت خطرہ میں پڑ گیا ہے۔اس صورت حال کی ساری ذمہ داری موجودہ وائس چانسلر پر جاتی ہے۔ اس لئے انھیں فوراً استعفا دے کر الگ ہو جانا چاہئے۔ رزولیوشن میں کہا گیا تھا کہ جنرل باڈی مطمئن ہے کہ اپنی اس منصفانہ پوزیشن میں اس کو یونیورسٹی کے تمام لوگوں کی حمایت حاصل ہے:

It has the backing of the entire University community.

میں نے علی گڑھ کے ایک اولڈ بوائے سے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگر بگاڑ صرف وائس چانسلر میں ہوتا اور پوری یونیورسٹی کمیونٹی اس کے خلاف ہوتی تو ایسا عمومی بگاڑ یونیورسٹی میں وجود ہی میں نہ آتا، ایک شخص کبھی بھی عمومی بگاڑ پیدا نہیں کرسکتا۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے۔ اپنے کو برحق ثابت کرنے کے لئے کس طرح آدمی خلاف واقعہ باتیں بولتا ہے۔

سیمنار اور ڈنر سے فارغ ہوکر قیام گاہ ( گلزار ابراھیم ) پہنچا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ یہاں جناب عقیل احمد صاحب، جناب اجمل الرحمٰن صاحب، جناب رشید احمد صاحب اور کچھ دوسرے حضرات اکٹھا ہوگئے۔ان سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں اس سے ہمیں پورا اتفاق ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس وقت مسلمان سخت مایوسی میں مبتلا ہیں، انھیں مایوسی کی اس دلدل سے کس طرح نکالا جائے۔

میں نے کہا کہ اس کا سبب داخلی ہے نہ کہ خارجی۔موجودہ مایوسی کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کو بار بار ناقابل حصول نشانوں کی طرف دوڑایا گیا۔ ناقابل حصول نشانہ کی طرف دوڑانے کا نتیجہ ہمیشہ مایوسی ہوتا ہے اور قابل حصول نشانہ کی طرف دوڑانے کا نتیجہ ہمیشہ امید۔

۲۴ اکتوبر کی صبح کو نماز فجر کے بعد جناب عقیل احمد صاحب کے ساتھ چائے پی۔اس کے بعد دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔عقیل احمد صاحب کے بھتیجے مسٹر محمد عظیم اس سفر میں میرے ساتھ تھے۔وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم بی بی ایس کے طالب علم ہیں۔وہ سرسید ڈے کے سلسلہ میں اپنے وطن آئے تھے، اور اب دہلی ہوتے ہوئے علی گڑھ جارہے ہیں۔ان سے مسلم یونیورسٹی کے

بارہ میں گفتگو ہوتی رہی۔

انھوں نے بتایا کہ میرے والد نے بھی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ والد صاحب کہتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں ہاسٹل میں وارڈن کا بہت دبدبہ ہوتا تھا۔ ہم لوگ وارڈن کے دباؤ میں رہتے تھے ۔ یہ دباؤ ہمیں تعلیم کے علاوہ دوسری فضولیات سے بچائے رکھتا تھا۔ مگر عظیم صاحب نے بتایا کہ اب یہ حال ہے کہ مہینوں تک وارڈن کی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ ہوسٹلوں میں وارڈن کے کمرے ہیں۔ مگر وارڈن ہمیشہ باہر رہتے ہیں۔ وہ طلبہ پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کرتے اس کی وجہ طلبہ میں بڑھی ہوئی انارکی ہے۔ پہلے طلبہ وارڈن سے ڈرتے تھے۔ اب وارڈن خود طالب علموں سے ڈرتے ہیں۔ اس نے تعلیم کا معیار آخری حد تک گرا دیا ہے۔

تعلیمی معیار پست ہونے کا ایک سبب رزرویشن بھی ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں پچاس فی صد سیٹیں انٹرنل کے لئے مخصوص ہیں۔ چنانچہ طلبہ سوچتے ہیں کہ ہم پڑھیں یا نہ پڑھیں، ہمارا داخلہ تو ہر حال میں ہو جائے گا۔ اس تحفظ نے طلبہ کے اندر علمی ذوق کا خاتمہ کر دیا ہے۔

میں نے عظیم صاحب سے پوچھا کہ طلبہ پھر کرتے کیا ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی کے اطراف میں کثیر تعداد میں ڈھابے کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر وہ چائے پیتے ہیں، گانا سنتے ہیں، تفریحی باتیں کرتے ہیں۔ یہی ان کا روزانہ کا مشغلہ ہے۔ میں نے پوچھا کہ طلبہ جب آپس میں بیٹھتے ہیں تو کیا وہ اپنے کورس کی باتیں کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایسے طالب علم اتنے کم ہیں کہ ان کا کوئی فی صد مقرر کرنا مشکل ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ علی گڑھ کی ڈگری کی علی گڑھ سے باہر کوئی قیمت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رعایت ترقی کی قاتل ہے۔

عظیم صاحب نے ایک عجیب واقعہ بتایا۔ کچھ سال پہلے ٹاٹا کے لوگ علی گڑھ آئے۔ اور یہاں سے ایک درجن انجینئر طلبہ کو بھرتی کر کے لے گئے۔ انھوں نے ان طلبہ کو ایک بڑے پلانٹ میں لگایا۔ مگر انھوں نے عدم مہارت کی بنا پر فیکٹری کے ایک قیمتی بوائلر کو تباہ کر دیا۔ اس میں ٹاٹا کا کئی کروڑ روپیہ کا نقصان ہوا۔ اس کے بعد یہ حال ہوا کہ ٹاٹا والوں کا جب کوئی اشتہار نکلتا تو اس میں یہ لکھا ہوا رہتا تھا:

Aligarh students need not apply.

ہم چلتے ہوئے پونے آٹھ بجے صبح مودی نگر میں داخل ہوئے۔ یہ ایک صنعتی شہر ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سڑک کے دونوں طرف کئی کیلومیٹر کی لمبائی میں آباد کیا گیا ہے۔ اس صنعتی شہر کو ملتانی مل مودی نے آباد کیا تھا۔ اس کے بعد گوجرمل مودی نے اس کو ترقی دی۔

یہاں سڑک کے دونوں طرف لڑکے اور لڑکیاں اسکول کا بیگ اپنی پیٹھوں پر لادے ہوئے چل رہے تھے۔ لڑکیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ ان کے لباس اور ان کے حلیہ سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تقریباً سب کے سب پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مودی نگر سے گزرتے ہوئے مجھے یہ غم ناک احساس ہوا کہ مسلمان زندگی کی سرگرمیوں سے دور ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص پاکٹ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر عمومی مراکز حیات میں ان کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ میں نے اپنی آنکھ بند کر لی۔ پھر خیال آیا کہ میں نے جس طرح آنکھ بند کر لی ہے، اگر ڈرائیور اسی طرح اپنی آنکھیں بند کر لے تو اس کی گاڑی آگے کی سواری سے ٹکرا جائے گی۔ مسافر خواہ سو رہے ہوں لیکن ڈرائیور کو جگنا پڑتا ہے، مسافر خواہ آنکھیں بند کر لے مگر ڈرائیور کے لئے اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں کہ وہ اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ ہو۔

۲۴ اکتوبر کو ساڑھے نو بجے صبح میں دہلی واپس آ گیا۔ دہلی سے مظفر نگر جاتے ہوئے ہم لوگ دو جگہ ٹھہرے تھے۔ چنانچہ وہاں پہنچنے میں چار گھنٹے لگ گئے۔ واپسی میں مسلسل سفر کیا گیا۔ اس لئے صرف ڈھائی گھنٹے میں ہم لوگ دہلی پہنچ گئے۔

# تقابل کا مسئلہ

امریکہ کے ایک سفر میں میری ملاقات کچھ ایسے مسلمانوں سے ہوئی جو ہندستان سے جا کر امریکہ میں آباد ہو گئے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنے وطن کو چھوڑ کر یہاں کیوں چلے آئے ۔ ہر ایک کا جواب یہ تھا کہ امریکہ میں ہمارے لئے پیس (امن) ہے، اور ہندستان میں ہمارے لئے پیس نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ پیس کا تعلق کسی ملک سے نہیں۔ بلکہ پیس کی ایک قیمت ہے، آپ جہاں بھی وہ قیمت ادا کریں، وہاں آپ کو پیس مل جائے گا۔ یہ قیمت ایڈجسٹمنٹ ہے۔

پھر میں نے کہا کہ امریکہ میں بھی مسلمانوں کے لئے وہ تمام مسائل موجود ہیں جو ہندستان میں ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہندستان میں وہ ان مسائل کو لے کر بے برداشت ہو جاتے ہیں۔ اور امریکہ میں ان مسائل کے اوپر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں ان کے لئے امن ہے اور ہندستان میں ان کے لئے امن نہیں۔ میں نے کہا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے پرسنل لاء میں مداخلت کا مسئلہ ہے، ملازمتوں میں امتیاز کا مسئلہ ہے، درسی کتابوں میں غیر اسلامی مضامین کا مسئلہ ہے، مسجد کی بے حرمتی کا مسئلہ ہے، وغیرہ۔ یہ تمام مسائل امریکہ میں بھی پوری طرح موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہندستان میں ان چیزوں کو لے کر احتجاجی سیاست چلاتے ہیں اور امریکہ میں ان چیزوں کو نظر انداز کر کے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی روش میں اسی فرق نے بے امنی کا مسئلہ پیدا کیا ہے نہ کہ دو ملکوں کے فرق نے۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اکثر لوگ غلط تقابل میں مبتلا رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بیشتر فکری غلطیاں غلط تقابل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ صحیح تقابل سے صحیح فکر بنتا ہے اور غلط تقابل سے غلط فکر۔ اس دنیا میں صحیح رائے صرف وہ لوگ قائم کر سکتے ہیں جو اس فکری حکمت کو جانیں۔ جو لوگ اس فکری حکمت سے محروم ہوں وہ صحیح رائے سے بھی محروم رہیں گے۔

## سوال

حکمت یا وزڈم کیا ہے۔ حکیم (wise man) کس کو کہا جا سکتا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ لوگوں میں اس کا واضح تصور نہیں ہے۔ اکثر لوگ محض خوش فہمی کی بنا پر کسی کو حکیم الاسلام اور کسی کو حکیم الامت کہنے لگتے ہیں۔ اس معاملہ کی وضاحت فرمائیں۔ (عبدالسلام اکبانی، ناگپور)

## جواب

حکمت یا وزڈم ایک اعلیٰ ترین ذہنی صفت ہے۔ میرے علم کے مطابق، انسانی تاریخ میں سب سے کم پائی جانے والی صفت یہی ہے۔ عام زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکمت ایک ایسی ذہنی صلاحیت ہے جو گہری بصیرت کے نتیجہ میں کسی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ برٹش کلرجی مین اور مصنف ولیم رالف انگ (William Ralph Inge) ۱۸۶۰ میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے نہایت درست طور پر حکیم یا دانا شخص کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ دانا انسان وہ ہے جو چیزوں کی اضافی قدر کو جانے:

The wise man is he who knows the relative value of things.

اضافی قدر یا ریلیٹیو ویلو کیا ہے، انگریزی ڈکشنری میں اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے: کسی اور چیز کی نسبت سے اہمیت و معنویت ہونا:

Having significance in relation to something else

اس حکمت یا دانائی کی ایک تاریخی مثال حدیبیہ کا معاملہ ہے۔ اس موقع پر پیغمبر اسلام اور آپ کے مخالفوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کا ایک پہلو وہ تھا جو بظاہر سب کو دکھائی دیتا تھا۔ یعنی پیغمبر اسلام کا مخالفین کی شرائط کو یک طرفہ طور پر مان لینا۔ بظاہر یہ طریقہ اتنا نازیبا تھا کہ حضرت عمر نے اس کو دَنِیَّة قرار دیا۔ یعنی ذلت کو اختیار کرنا۔ (البدایۃ والنھایۃ ۴/ ۱۶۸)۔ مگر اسی کے ساتھ اس معاملہ کا ایک اور پہلو تھا جو بظاہر معاہدہ کے وقت دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ یہ کہ کسی بھی طرح اگر ایسا ہو کہ باہمی ٹکراؤ ختم ہو جائے اور دونوں فریقوں کے درمیان معتدل فضا میں انٹر ایکشن ہونے لگے تو لوگوں کے اندر تیزی سے اسلام پھیلنا شروع ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ

وقت آ جائے گا جب کہ دشمن لوگ اسلام قبول کر کے اسلام کے قریبی مددگار بن جائیں (حم السجدہ ۳۴) جیسا کہ بعد کو عملاً پیش آیا۔ گویا حدیبیہ کے معاہدہ کا ایک پہلو وہ تھا جس کو ہر صاحب بصارت دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کا ایک اور اہم تر پہلو وہ تھا جس کو صرف صاحب بصیرت ہی دیکھ سکتا تھا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: **فعلم ما لم تعلموا** (الفتح ۲۷) یعنی اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہیں جانی۔ اضافی قدر یا ریلیٹیو ویلو کو جاننے کی اہمیت یہ ہے کہ اکثر حالات میں یہی پہلو عملی اعتبار سے فیصلہ کن بن جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم مفکرین کی سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ وہ اس حکیمانہ بصیرت سے خالی تھے۔ وہ سامنے کی چیزوں کو دیکھ کر اقدامات کرتے رہے۔ وہ ان دوسرے پہلوؤں کو دیکھنے سے قاصر رہے جو آخر کار فیصلہ کن بننے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام اقدامات نہ صرف بے نتیجہ رہے بلکہ وہ الٹا نتیجہ پیدا کرنے والے (counter productive) ثابت ہوئے۔ مثال کے طور پر مصر اور پاکستان اور ایران میں اسلام پسندوں کا یہ سمجھ لینا کہ ان کی معاصر حکومت تمام خرابیوں کی جڑ (source of all evils) ہے۔ اگر وہ کسی طرح موجودہ حکمرانوں کو اقتدار سے ہٹا دیں تو وہاں شاندار طور پر اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح برصغیر ہند میں مسلم رہنماؤں نے یہ سمجھ لیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جغرافی تقسیم مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل ہے۔ ان تمام رہنماؤں کی مشترک کوتاہی یہ تھی کہ وہ صرف سامنے کی باتوں کو دیکھ سکے، وہ ان اضافی اسباب (relative factors) کو دیکھنے سے عاجز رہے جو آخر کار فیصلہ کن بن کر ان کی تمام خوش فہمیوں کو تہ و بالا کر دینے والے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان تمام رہنماؤں کی ہنگامہ خیز تحریکیں مسلمانوں کی تباہی میں اضافہ کے سوا کوئی اور نتیجہ پیدا نہ کر سکیں۔ اسی حقیقت کو حضرت عمر فاروق نے ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے کہ عقل مند وہ نہیں ہے جو شر کے مقابلہ میں خیر کو جانے۔ عقل مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کم تر شر کون سا ہے۔ (**لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر و لکنه الذی یعرف خیر الشرین**)

سوال

الرسالہ مئی ۱۹۹۹ پڑھا۔ اس میں ایک مضمون ''جنتی کون'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ: جنتی انسان وہ ہے جس نے دنیا ہی میں آخرت کا تجربہ کیا۔ جس نے آخرت میں خدا کو براہ راست دیکھنے سے پہلے اسی دنیا میں اس کو بالواسطہ طور پر دیکھا۔ (صفحہ ۴) اس جملہ کی وضاحت مطلوب ہے۔ دنیا میں خدا کو بالواسطہ طور پر دیکھنے سے کیا مراد ہے۔ (عبدالسلام، جامعہ دارالسلام، عمرآباد)

جواب

''خدا کو بالواسطہ دیکھنے'' سے مراد وہی چیز ہے جس کو حدیث میں تعبداللہ کانک تراہ (البخاری) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے صرف اس کو قابل فہم بنانے کے لئے نئے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ایک ہے خدا کی ذات کو دیکھنا۔ دوسرا ہے خدا کی آیات اور آلاء کے ذریعہ خدا کو پہچاننا۔ پہلے معنی میں صرف آخرت میں کسی کو خدا کا مشاہدہ حاصل ہوگا۔ دوسرے معنی میں یہ تجربہ اسی دنیا میں گزرتا ہے۔ حدیث کے الفاظ میں، دنیا میں آدمی گویا کہ خدا کو دیکھتا ہے اور آخرت میں وہ خدا کو حقیقی طور پر دیکھے گا۔ پہلا دیکھنا بالواسطہ طور پر دیکھنا ہے، اور دوسرا دیکھنا براہ راست طور پر دیکھنا۔

سوال

قرآن نے سوچنے اور سمجھنے کی نسبت قلب کی طرف کی ہے۔ اور حالیہ سائنس کی تحقیقات یہ ہیں کہ یہ دونوں صلاحیتیں دماغ کی ہیں۔ دل (قلب) کی حیثیت ایک پمپ سے زیادہ نہیں۔ تو اس میں تطبیق کی صورت کیا ہوگی؟ (ابرار احمد رفعت، سورت)

جواب

قرآن میں قلب کا لفظ حیاتیاتی اصطلاح کے طور نہیں آیا بلکہ اپنے ادبی استعمال کے طور پر آیا ہے۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں آج بھی قلب کا لفظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے جس معنی میں وہ قرآن میں استعمال کیا گیا ہے معروف اصول کے مطابق، قرآن کی ان آیتوں

میں قلب کے لفظ کو اس کے ادبی مفہوم کے اعتبار سے لینا چاہئے نہ کہ اس کے حیاتیاتی مفہوم کے اعتبار سے۔ قلب کے لئے انگریزی میں ہارٹ (Heart) کا لفظ ہے۔ حیاتیاتی کتاب میں اس لفظ کی تشریح گردش خون کے مرکز کی حیثیت سے ملے گی۔ لیکن آپ انگریزی کی کوئی ڈکشنری دیکھیں تو اس میں درجنوں ایسے استعمال ملیں گے جن میں ہارٹ کو مرکز جذبات کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً With all one's heart یعنی بہت خوشی سے۔ شیکسپیر کی ایک لائن اس طرح ہے: A good heart is worth gold اس معاملہ کا تعلق صرف قلب سے نہیں ہے بلکہ دوسرے سیکڑوں الفاظ سے بھی ہے۔ مثلاً سن لائٹ اور مون لائٹ، وغیرہ۔

سوال

تقدیر کیا ہے؟ انسان کا معاملہ تقدیر کے تحت ہے یا تدبیر کے تحت۔ اگر تقدیر کے تحت ہے تو اس کا مطلب ہے کہ انسان مجبور ہے۔ پھر انسان کا امتحان کیوں؟ اور اگر تدبیر کے تحت ہے تو سمجھ میں نہیں آتا، کیوں کہ بہت سے معاملات میں انسان اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔
(محمد اسحاق، عمر آباد)

جواب

یہ معاملہ پیچیدہ اس لئے نظر آتا ہے کہ لوگ اس معاملہ میں ثنائی طرز فکر (Dichotomous thinking) کا شکار ہیں۔ یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ یا تو سارا معاملہ تقدیر پر مبنی ہے یا سارا معاملہ تدبیر پر۔ حالانکہ یہ معاملہ ففٹی ففٹی کا ہے۔ یعنی جزئی طور پر تقدیری اور جزئی طور پر تدبیری۔ ایسا اس لئے ہے کہ انسان موجودہ دنیا میں آزمائش کے لئے رکھا گیا ہے اور آزمائش کی مصلحت چاہتی ہے کہ ایسا ہی ہو۔ آدمی جب اپنے آپ کو مجبور محسوس کرے تو وہ عاجزانہ طور پر خدا کو پکارے اور جب وہ اپنے آپ کو آزاد پائے تو وہ خدا کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا کرے۔ قرآن میں خدا کے مطلوب بندوں کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: یدعون ربھم خوفاً وطمعاً (السجدہ۔ ۱۶)۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ: الایمان بین الرجاء والخوف۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ بندے کے اوپر اپنے رب کی نسبت سے دو مختلف قسم کی کیفیات طاری ہوں۔ کبھی خوف کی کیفیت اور کبھی امید کی کیفیت۔ یہ دوطرفہ کیفیات کسی بندہ کے اوپر صرف اسی وقت طاری ہوسکتی ہیں جب کہ وہ اس دنیا میں خوف کی حالت کا تجربہ کرے اور کبھی امید کی حالت کا۔ چونکہ حالات کے بغیر کیفیات پیدا نہیں ہوسکتیں اس لئے انسان کو بیک وقت جبر اور اختیار کے دوطرفہ نظام کے تحت اس دنیا میں رکھا گیا۔

سوال

مجھے قرآن کے مطالعہ سے دلچسپی ہے۔ اس سلسلہ میں میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ قرآن فہمی کا اصول کیا ہے۔ (ایک قاری، الرسالہ)

جواب

قرآن کے مطالعہ کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے اس کا علمی اور فنی مطالعہ۔ اور دوسرا ہے قرآن کا تذکیری مطالعہ۔ اگر آپ قرآن کا علمی اور فنی مطالعہ کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو بہت سے علوم میں گہری واقفیت پیدا کرنی ہوگی جن کی تعداد اہل تفسیر نے کئی درجن بتائی ہے۔ مگر اس قسم کا مطالعہ مخصوص علماء کا کام ہے۔ وہ عام انسان کی ضرورت نہیں۔ عام انسان جو قرآن کو سادہ طور پر سمجھنا چاہتا ہو اور اس کو پڑھ کر اپنی فکری اور عملی اصلاح کرنا چاہتا ہو، ایسے انسان کے لئے درجنوں علوم میں مہارت پیدا کرنا ضروری نہیں۔ ایسے آدمی کے لئے دو چیزیں کافی ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عربی زبان سے واقف ہو اور صالح نیت کے ساتھ قرآن کو پڑھے۔ تاہم اسی کے ساتھ اس کو مستند تفسیروں کا مطالعہ بھی ضرور کرنا چاہئے خاص طور سے عربی تفسیروں کا۔ ورنہ دوسری زبانوں میں لکھی ہوئی تفسیروں کا مطالعہ بھی اس کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے ذہنی سانچہ کے مطابق آیتوں کا مفہوم متعین نہ کرے بلکہ خود قرآن نیز حدیث کی روشنی میں اس کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کا درست مطالعہ آدمی کو ہدایت تک پہنچاتا ہے اور اس کا نادرست مطالعہ برعکس نتیجہ کا سبب بنتا ہے۔